ہمدردی و دلسوزی، جذبۂ اخلاص اور وطن دوستی پر اپنے تاثرات اچھے انداز میں پیش کئے ہیں، محمد حسین عثمانی نے ایک وطن دوست کے عنوان سے مختصر مگر جامع مضمون تحریر کیا ہے، نورالرحمٰن اور ابراہیم فکری نے مولانا کی شاعری پر تبصرہ کیا ہے، جس سے ان کی زندگی اور شاعری کے مختلف ادوار سامنے آجاتے ہیں، سب سے طویل اور قیمتی مضمون سید حامد صاحب کا "مولانا محمد علی کی شخصیت ادبی غیر ادبی" کے عنوان سے ہے، اس میں مولانا محمد علی کے نامور معاصرین کے مقابلہ میں ان کی عظمت و برتری دکھائی ہے، انڈین نیشنل کانگریس اور گول میز کانفرنس میں مولانا کی تقریریں بھی شامل کر دی گئی ہیں، جس سے ان کی سیاسی بصیرت کے علاوہ ان کی قوت ایمانی کا بھی اندازہ ہوتا ہے، آخر میں ببلیوگرافی کے عنوان سے نظر برنی اور محمد لقا ملکہ صاحبہ نے مولانا پر لکھے گئے مضامین اور کتابوں کی نشاندہی کی ہے جو بہت تشنہ ہے، مولانا عبد اللہ کا ایک عربی مرثیہ اردو ترجمہ کے ساتھ بھی درج ہے، کتاب میں، کتابت و طباعت کی بعض خامیاں بھی ہیں، صفحہ پر کرۂ ارض سے محسوس کے بجائے محو ہونا چاہئے، صفحہ ۱۷۷ پر اسراف کا املا اصراف ہے عدم اعتدال کے بجائے بے اعتدالی لکھنا چاہئے، ازلی کا املا اذلی لکھا ہے، صفحہ ۱۹۲ پر آرایش و پیرائش کے بجائے آرائش و زیبایش ہونا چاہئے، صفحہ ۱۹۲ پر گویا کہ کے بجائے گو کہ لکھنا تھا، صفحہ ۱۹۶ پر شقری اور بیادہ رو نثر جیسے الفاظ سے مفہوم واضح نہیں ہوتا، صفحہ ۲۲۱ پر فائز المرامی کو فائز المرانی لکھا ہے، ارادہ تقسیم کرنا نہیں ارادہ فسخ کرنا لکھنا چاہئے، اسی صفحہ پر مرثیہ عربی کے بجائے دثنا العربیہ ہونا تھا، صفحہ ۱۶۱ پر اسرار بصری نام درج ہے جب کہ یہ رمزی نام ہے، اس کا صحیح نام شورش کاشمیری لکھنا تھا۔ ان خامیوں کے باوجود یہ مجموعۂ مضامین مولانا کے فضل و کمال، ذہانت، عبقریت، فراست و تدبر ادبی، علمی، سیاسی اور دینی عظمت، متنوع و ہمہ گیر شخصیت کا ایک اچھا مرقع ہے۔

م - ن

جلد ۱۲۵ ماہ جمادی الثانی سنہ ۱۴۰۰ھ مطابق ماہ مئی سنہ ۱۹۸۰ء عدد ۵

مضامین

شذرات

گذشتہ مارچ اور اپریل کا بڑا حصہ کلکتہ، لکھنؤ، علی گڑھ اور بمبئی کے علمی سمیناروں کی شرکت میں گذرا جن میں پرانے اور نئے علم دوستوں کے طرز فکر اور اسلوب بیان کا اندازہ کرنے کا موقع ملا۔

*

۱۵ و ۱۶ مارچ کو ایران سوسائٹی کلکتہ کی طرف سے عمر خیام کا نوسو سالہ جشن تھا، اس سوسائٹی کو ڈاکٹر محمد اسحق مرحوم سابق استاد فارسی کلکتہ یونیورسٹی نے ۱۹۴۴ء میں قائم کیا تھا، ان کی وفات کے بعد اس کے دو مخلص عہدیدار جناب محمد عبد المجید جنرل سکریٹری اور خواجہ محمد یوسف خازن نے اس کو بہت متحرک، جاندار اور باوقار بنا دیا ہے، اور اب جناب ڈاکٹر عطا کریم برق صدر شعبۂ فارسی کلکتہ یونیورسٹی بھی اس کے نائب صدر کی حیثیت سے اس کو آگے بڑھانے میں سرگرم ہیں، اس علمی ادارہ سے ہر فرقہ کے علم دوستوں کو بھی بڑی دلچسپی ہے، اس کے عہدیداروں اور ممبروں میں روسی۔ بی۔ جمی، ڈی پولاڈی ان، مسز گور ساہنی، جے۔ این تعلقدار، جے۔ آر۔ مہتا، ایس۔ بی۔ رائے اور ڈاکٹر جگدیش نرائن سرکار جیسے اہل علم بھی ہیں، عمر خیام کو ہندوستان فراموش کر رہا تھا، ایران سوسائٹی کی اس تقریب سے اس کی یادوں کی شمع یہاں پھر روشن ہوگئی، اس کا افتتاح مغربی بنگال کے گورنر جناب ٹی۔ این سنگھ نے ایک جگمگاتے ہوئے پنڈال کے بھرے مجمع میں کیا، کلکتہ کے علمی جلسوں میں برابر شرکت کرنے کا موقع ملا، اس کاروباری اور ہنگامہ پرور شہر میں ایسی مجلسوں کے حاضرین کو ہر طرح متین اور مہذب پایا۔

*

اس کے سیمینار کی صدارت ڈاکٹر نذیر احمد سابق صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے کی، مقالہ نگار یوپی، دہلی، حیدرآباد اور مدراس سے آئے ہوئے تھے، بنگال کے ہندو مقالہ نگاروں اور مقرروں میں پروفیسر ڈاکٹر جگدیش نرائن سرکار، پی۔ این۔ چوپڑا، ایس۔ بی۔ رائے، پولاڈی این، ڈاکٹر آر کے پودار،

وائس چانسلر کلکتہ یونیورسٹی اور ڈاکٹر پرتاپ چندر سابق وزیر تعلیم حکومت ہند بھی تھے، بعض مقالوں اور تقریروں سے اندازہ ہوا کہ خیام سے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں، وہ اب تک دور نہیں ہوئی ہیں، کلکتہ میں خیام بار کے ایک بورڈ پر بھی نظر پڑی، سمینار میں جتنے مقالات پڑھے گئے، وہ ایران سوسائٹی کے رسالہ انڈو ایرانیکا میں شایع ہوگئے تو اس کے قارئین کے سامنے اصلی خیام کی تصویر آجائے گی، راقم نے اپنے مقالہ اور تقریر میں اس پر زور دیا کہ فٹز جیرالڈ کے ذریعہ سے ایک رند قسم کا جعلی خیام نمودار ہوا، اصلی خیام مسلمان تھا جو توحید، رسالت، حشر، جزا و سزا اور معاد کا قائل تھا، اس نے حج بھی کیا، وہ فلسفی حکیم کے بجائے صوفی حکیم تھا اور مشائیت آمیز فلسفیانہ اسلام کا پیرو رہا جس کا خاکہ فارابی کی فصوص اور بوعلی سینا کی اشارات اور الٰہیات میں نظر آئے گا۔

*

اس موقع پر کلکتہ کے مشہور میوزیم میں خیام پر ایک نمائش بھی بہت سلیقہ سے سجائی گئی تھی، اس میں خیام کی رباعیوں کی اعلیٰ خطاطی کے نمونے بھی دکھائے گئے، ایک علیحدہ مطبوعہ پمفلٹ میں خیام کی ان تصانیف اور رباعیات کے ان نسخوں کی بھی نشاندہی بڑی محنت سے کی گئی تھی جو اس وقت دنیا کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں، ایک نشست میں خیام کی رباعیاں بھی پڑھی اور گاکر سنائی گئیں، ان کو مجمع جس شوق سے سن رہا تھا اس کو دیکھ کر تعجب ہوا، اس تقریب کو ہر طرح کامیاب بنانے میں جناب ایم اے مجید اور جناب خواجہ محمد یوسف اپنے شرکائے کار جناب شبلی علقمہ، مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی اور ڈاکٹر سید منال شاہ القادری کے ساتھ پوری مستعدی اور تن دہی سے کام لے رہے تھے، خواجہ محمد یوسف صاحب کلکتہ ہائی کورٹ کے کامیاب سینیر ایڈووکیٹ ہیں، انھوں نے بیرونی مہمانوں کی خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، وہ جس قرینہ سلیقہ اور محنت سے اس قسم کی تقریبوں میں سرگرم رہتے ہیں، اس سے ان کے نوجوان ساتھی درس لے سکتے ہیں۔

*

۲۶ مارچ کو مولانا ابو الکلام آزاد اکیڈمی لکھنؤ میں مولانا ہی پر ایک سیمینار تھا، پہلے اس کو یوپی حکومت کی طرف سے امداد ملتی تھی، اس کے گذشتہ دو سیمیناروں کے دو مجموعے "ابو الکلام آزاد، احوال و آثار" اور "نقوش ابو الکلام آزاد" کے نام سے چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں، جنتا حکومت کے زمانہ میں اس کی سرکاری امداد بند ہو گئی، مگر اس کے باہمت سکریٹری

جناب عبدالجبار جلالی اور دوسرے اولوالعزم عہدیداروں نے خود سرمایہ جمع کر کے سیمینار میں ہندوستان کے مختلف گوشوں سے تقریباً بیس مقالہ نگاروں کو مدعو کیا، اس کی صدارت مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے کی، خصوصی مہمان مصر کے وزیر اوقاف جناب عبدالمنعم النمر تھے، یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ انھوں نے مصر میں مولانا آزاد پر ایک مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی ہے، ان کے ساتھ مصر کے مشہور قاری عبدالباسط بھی تھے جن کی سامعہ نواز، دل گداز اور ایمان افروز قرات سے محظوظ ہونے کے لئے لکھنؤ کے لوگ گنگا پرشاد میموریل ہال میں ٹوٹے پڑتے تھے، اس لئے یہ سیمینار قرات کی ایک دلآویز تقریب میں تبدیل ہو گیا جس کے بعد مقالہ نگاروں نے خود ہی مقالات پڑھ کر سامعین کو گرانبار کرنا پسند نہیں کیا، البتہ خصوصی مہمان نے مولانا آزاد کی شخصیت پر ایک پر مغز تقریر کی، خیال تھا کہ مولانا آزاد پر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کرنے والے معزز مہمان کی زبان سے اردو میں بھی تقریر سننے میں آئے گی، مگر ان کی تقریر برابر عربی میں ہوتی رہی، جس کا اردو ترجمہ ندوہ کے مولانا شمس الحق ندوی کرتے رہے، ان کے بعد مولانا ابوالحسن علی ندوی اور جناب ضیاء الرحمٰن انصاری نائب وزیر ریاست حکومت ہند کی تقریریں ہوئیں، پھر ایک پرتکلف عشائیہ کے بعد یہ تقریب ختم ہو گئی، امید کہ اکیڈمی کے عہدیدار مقالہ نگاروں کے مضامین پھر ایک کتابی صورت میں شایع کر کے ایک مفید خدمت انجام دیں گے، اس میں راقم نے "مولانا ابوالکلام آزاد کے جلووں کی رنگارنگی" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا۔

* * *

۲۸، ۲۹، ۳۰ مارچ کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کی طرف سے "یورپ پر اسلام کا اثر" کے موضوع پر ایک سیمینار تھا، اس کے داعی ڈاکٹر امجد علی کی علالت کی وجہ سے اس کی کارروائی ڈاکٹر محمد اقبال صدر شعبۂ اسلامیات کی نگرانی میں انجام پائی، جن کو ایسی تقریبوں کو بڑی خوش سلیقگی سے انجام دینے کی مہارت ہے، اس میں یو۔پی کے علاوہ کلکتہ، حیدرآباد، مدراس، اندور اور دہلی کے اہل قلم مدعو تھے، اس کا افتتاح مسلم یونیورسٹی کے قائم مقام وائس چانسلر پروفیسر محمد شفیع نے کیا، اس موقع پر اتفاق سے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبۂ تاریخ کے لائق استاد اور مشہور اہل قلم محمد اسلم صاحب بھی موجود تھے، جنھوں نے اس موضوع پر ایک اچھی تقریر کی، اس کے پانچ اجلاس مولانا سعید احمد اکبرآبادی (مسلم یونیورسٹی)، ڈاکٹر امیر حسن عابدی (دہلی یونیورسٹی)، ڈاکٹر علیم اشرف (جامعہ ملیہ)، جناب ضیاء الحسن فاروقی پرنسپل جامعہ کالج) اور اس راقم کی صدارت میں ہوئے۔

* * *

اس اہم موضوع کے لحاظ سے امید تھی کہ مسلم یونیورسٹی کے ہر شعبہ کے اساتذہ اس میں بڑے شوق سے حصہ لیں گے، لیکن یونیورسٹی کے اکابر اور ممتاز اساتذہ کی عدم شرکت سے تعجب ہوا، ڈاکٹر محمد اقبال انصاری کا خیال ہے کہ سیمینار اچھا وہی ہوتا ہے جس میں سامعین صرف مقالہ نگار ہی ہوں، مگر اس طرح اس کی افادیت محدود ہو جاتی ہے، ڈاکٹر محمد اقبال انصاری نے اپنی اختتامی تقریر میں یہ بھی کہا کہ مارچ کے مہینہ میں مقالہ نگاروں کو مختلف سیمیناروں میں جانا ہوتا ہے، اس لئے وہ اپنا مقالہ بہت عجلت میں لکھتے ہیں، یہ بات سیمینار کے مقالہ نگاروں کے لئے ضرور قابل غور ہے، مگر بعض مقالہ نگار محنت سے طویل مقالہ لکھ کر لاتے ہیں تو ان سے چند منٹوں میں اس کو ختم کرنے کی فرمائش ہوتی ہے جس سے ان کی محنت رائگاں ہوتی نظر آتی ہے، سیمینار میں زیادہ تر مختصر مقالے پسند کیے جاتے ہیں، اختصار نویسی ضرور ایک اہم آرٹ ہے، مگر یہ کوئی ضروری نہیں کہ تحقیقی مضامین کے لئے بھی یہ کارآمد ہو۔

* * *

بمبئی کے سیمینار میں جاتے ہوئے نئی دہلی میں دو روز برادرم سید شہاب الدین دسنوی کے ساتھ تغلق آباد میں ٹھہرا، جو وہاں کے ہمدرد کیمپس کے اس وقت ایڈمنسٹریٹر ہیں، جناب حکیم عبدالحمید صاحب تغلق آباد کے کھنڈر کو جس طرح اپنے گوناگوں پلان سے علم و فن کا شہر آباد بنا رہے ہیں، اس سے ان کی وہی اولوالعزمی اور بلند حوصلگی کا اظہار ہوتا ہے جو اکبر اعظم نے فتح پور سیکری کے ویرانے کو آباد کرنے میں دکھایا تھا، اکبر کے یہاں تو شاہی خزانہ تھا، مگر جناب حکیم عبدالحمید کے پاس صرف شاہانہ حوصلہ ہے، اس جگہ کی عالیشان عمارتوں کو دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ۱۹۴۷ء کے بعد شکست خوردہ مسلمانوں کے ایک باہمت فرد نے ایسے شاندار کارنامے انجام دے کر ان کی سرخروئی کا سامان کر دیا ہے، یہاں جناب حکیم عبدالحمید صاحب، جناب اوصاف علی (ڈائرکٹر اسلامک انسٹیٹوٹ لائبریری) اور جناب عبدالوحید صاحب سابق استاذ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے ساتھ بڑے خوشگوار لمحات گذرے۔

* * *

۶، ۷ اپریل کو بمبئی میں اخوان الصفا کے اسلامک انسٹیٹیوٹ کی طرف سے "اسلام اور دور جدید" پر ایک سیمینار تھا، اس کے داعی جناب اصغر علی انجینیر صاحب تھے، جو فرقہ بوہرہ اور اسلام پر کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں، بمبئی میں جناب سیٹھ عبدالعزیز انصاری رکن مجلس انتظامیہ دارالمصنفین کے یہاں حسب معمول ٹھہرا، انھوں نے غیر معمولی محنت سے بڑی دولت پیدا کی ہے، مگر اس لئے زندہ ہیں، خوشی محسوس کرتے ہیں کہ وہ اس کو اپنے مہمانوں کی پذیرائی میں صرف کرتے رہیں، ان کی میزبانی کی دریادلی اور کرم گستری میں قرون اولیٰ کی مہمان نوازیوں کی اعلیٰ روایت تازہ ہو جاتی ہے، ان کے بڑے صاحبزادے ابوصالح میاں اسم بامسمی ہونے کے علاوہ اپنے والد بزرگوار ہی کی خوبیوں کے حامل ہیں،

بمبئی کے قیام میں اس خاندان کے الطاف و اکرام کی وجہ سے دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ کی لذت ملتی رہتی ہے۔

*

بمبئی پہونچنے سے پہلے کانوں میں یہ بات پڑی تھی کہ یہ سیمینار ترقی پسندوں اور مارکسسٹوں کی طرف سے ہے، وہاں پہونچا تو جناب عبدالعزیز انصاری، ابو صالح سلیم، دارالمصنفین کے ایک لائف ممبر مولوی محمد مستقیم کی رائے ہوئی کہ اس میں ضرور شرکت کیجئے، وہاں اچھا ہی اثر ہوگا، مولوی مستقیم اصلاحی بھی ہیں، ندوی بھی اور دیوبندی بھی، بمبئی کے مذہبی کاموں میں بہت دلچسپی لیتے ہیں، ان ہی حضرات کے ساتھ سیمینار کے جلسہ گاہ صابو صدیق انسٹیٹیوٹ پہونچا، جہاں بمبئی کے مشہور اور ممتاز رہنما جناب معین الدین حارث صاحب پہلے سے موجود تھے انھوں نے ملنے میں اپنی دیرینہ محبت کی گرم جوشی کا اظہار کیا، افتتاحی جلسہ کے بعد دوسرے دن اس کی صدارت کے لئے میرے نام کا اعلان میری اجازت کے بغیر ہوا، مدعوئین میں بمبئی کے علاوہ حیدرآباد اور علی گڑھ کے مقالہ نگار تھے۔

*

جلسے کے حاضرین میں اسلام پسندوں کی اکثریت زیادہ نظر آئی، جن لوگوں نے مباحثے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا وہ زیادہ تر اسلامی خیالات کی ترجمانی کر رہے تھے، ٹائمس آف انڈیا میں جو روداد چھپی ہے وہ ایسے ہی لوگوں کے مطالب کے مطابق تھی، میرے مقالہ کا عنوان "اسلام کا تصور ریاست" تھا، اس کے آخر میں مولانا ابو الکلام آزاد کی ایک تحریر کا حوالہ تھا، جس میں انھوں نے صدائے ربانی سن کر کہا تھا کہ اگر مسلمانوں نے اپنے لئے ایک نیا بیت المال، ادارہ تو پولیٹیکل پالیسی تیار کر لی لیکن اگر انھوں نے اپنے معتقدات اور اعمال میں اسلام کی عملی روح پیدا نہیں کی اور اپنے دین کی سلطنت کے تحت داخل نہ کیا تو ان کی تمام سیاسی ہنگامہ آرائیاں ایک دقیقہ اور ایک عشر دقیقہ تک کے لئے بھی کچھ نفع نہیں پہونچا سکتیں۔

ایک نشست میں جناب اصغر علی انجینئر اور ان کے کچھ ساتھیوں نے بوہرہ فرقہ پر تفصیلی گفتگو کی، پھر داؤدی بوہرہ کمیشن اور تیواتیا کمیشن کی رپورٹیں تقسیم کی گئیں۔

جناب معین الدین حارث صاحب نے انجمن اسلام ریسرچ انسٹیٹیوٹ بھی دکھایا، وہاں وہ نہ ملے تو جناب نظام الدین گوریکر اور جناب ڈاکٹر شیخ فرید صاحب نے پیشوائی کی، یہاں جناب سید نجیب اشرف ندوی مرحوم اور عبدالرزاق قریشی مرحوم بہت یاد آئے جن کی وجہ سے اس انسٹیٹیوٹ کی علمی سرگرمیوں میں چار چاند لگ گئے تھے، ڈاکٹر شیخ فرید اپنے پیشروؤں سے متاثر ہیں، علمی ذوق کی وجہ سے یہاں کے علماء و فضلا پر بڑی اچھی نظر رکھتے ہیں، ان کی کتاب حضرت شاہ عیسیٰ جنداللہ چھپ کر مقبول ہوئی ہے، مولوی عبدالرحمن پرواز (مصنف مخدوم علی مہائمی اور مفتی صدر الدین آزردہ) اور ڈاکٹر خورشید احمد نعمانی (مصنف دارالمصنفین کی ادبی خدمات) سے بھی برابر ملاقاتیں رہیں، جناب معین الدین حارث صاحب انسٹیٹیوٹ میں نہ ملے تو ان کی ذاتی قیام گاہ پر گیا، اور دیر تک دارالمصنفین کے متعلق مفید مشورے دیتے رہے، دارالمصنفین آنے کا وعدہ بھی کیا، ان ہی دنوں اردو کے مشہور شاعر جناب علی سردار جعفری کا ایک آپریشن ہوا تھا، انھوں نے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا، ان کی عیادت کے لئے گیا، اپنے بستر علالت ہی پر اپنی ایک نظم پڑھ کر سنا کر تواضع کی،

مقالات

صلیبی جنگ اور اس کے اہم پہلو

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

"مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے اسلامک اسٹڈیز کے شعبہ میں 'امپیکٹ آف اسلام آن یورپ' (یورپ پر اسلام کے اثرات) کے عنوان سے ایک سیمینار ۲۸، ۲۹، ۳۰ر اپریل سنہ ۱۹۸۰ء کو ہوا، یہ مقالہ اسی کے لئے لکھا گیا، اور وہاں اس کے کچھ حصے پڑھے گئے، ترمیم و اضافہ کے بعد اب یہ معارف میں شائع کیا جا رہا ہے"

صلیبی جنگ مسلمانوں کی تاریخ کا المناک واقعہ بھی ہے، اور طربناک بھی، اس کی تفصیل دردانگیز بھی ہے اور ولولہ انگیز بھی، اس کے ساتھ عبرت، بصیرت اور غیرت کی بھی داستان ہے، یہ یورپ اور ایشیا، مغرب اور مشرق، مسلمانوں اور عیسائیوں، صلیب اور ہلال کی جنگ ہے، مگر اسی کے ساتھ اس میں اصلی جذبہ یہ کار فرما تھا کہ یورپ کے استیلاء اور غلبہ کا پرچم تو ایشیا بلکہ دنیا کے ہر گوشہ میں لہرائے، مگر یورپ کی سرزمین پر غیر یورپین اور خصوصاً مسلمانوں کا قدم کسی لحاظ سے بھی جمنے نہ پائے، مگر مسلمان ان کی مرضی کے خلاف اپنی سپہگری اور نبرد آزمائی سے یورپ پہونچے تو انھوں نے اسپین میں آٹھ سو برس تک حکومت کی، سسلی میں ان کی حکومت تقریباً دو سو برس تک رہی، دولت عثمانیہ کے حکمراں تو ساڑھے چھ سو برس تک یورپ کی سرزمین میں اپنا پرچم لہراتے رہے، مگر یورپ کے عیسائیوں کی نظروں میں یہ سلطنتیں خار کی طرح کھٹکتی رہیں، انھوں نے اس وقت دم لیا جب سسلی

اور اسپین سے مسلمانوں کو انتہائی بے رحمی اور سفاکی سے دربدر کیا اور دولت عثمانیہ کی قوت پر ایک کاری ضرب لگا کر اس کو کمزور کر دیا، حالانکہ سسلی میں مسلمانوں نے دو سو برس تک حکومت کی تو ڈریپر کے قول کے مطابق جنوبی اطالیہ اور سسلی میں ان کے موجود ہونے کی وجہ سے یورپ کی عقلی و دماغی ترقی کو بڑی قوت پہونچی (معرکۂ مذہب و سائنس ص ۱۴۱) اسپین کو مالی اور علمی ترقی دے کر بقول موسیو لیبان مسلمانوں نے یورپ کا سرتاج بنا دیا (تمدن عرب اردو ترجمہ ص ۲۵۰ - ۲۴۷) پھر دولت عثمانیہ کے عہد میں اس کے قلمرو کا تمدن یورپ کے کسی ملک سے کم نہیں رہا، سر ایڈوین پیرس ڈیلی نیوز کے نامہ نگار کی حیثیت سے ترکی میں مدتوں رہ چکے تھے، انھوں نے اپنی کتاب "ترکی اور اس کے باشندے" میں لکھا کہ اس کا دعویٰ بجا طور پر کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے اناطولیہ کے ترکوں کو ایک پرہیزگار قوم بنا دیا ہے (بحوالۂ دولت عثمانیہ ج ۲، ص ۴۴۹، مطبوعہ دار المصنفین) ایک اور انگریز لوسی گارنٹ نے لکھا کہ ترکی کے شہروں میں وہ اجڈپن اور وحشیانہ پن بہت کم ملتا ہے جو مغرب کے شہروں میں عام طور پر پایا جاتا ہے (ایضاً ص ۴۵۱) مگر مسلمانوں کے ان تینوں متمدن اور ترقی یافتہ ملکوں کو یورپ کے عیسائیوں نے ختم کر کے دم لیا.

یورپ کے عیسائیوں نے یورپ کی ان مسلم حکومتوں کو اس لئے برباد کیا کہ وہ یورپ میں ان کا اقتدار کسی طرح نہیں چاہتے تھے، اگر ان کا یہ جذبہ صحیح تھا تو پھر ان کو ایشیا کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے کا کوئی حق نہ تھا، مگر وہ جوع الارض میں ہمیشہ مبتلا رہے، اس لئے ان کو جب کبھی موقع ملا، ایشیا اور افریقہ کی سرزمین کو اپنی سیاست کے چوگان کا میدان بنا لیا اور اس کے لئے ہر طرح کا جواز پیدا کر لیا،

صلیبی جنگ کے اسباب

صلیبی جنگ میں ان کے یہی جذبات کارفرما رہے، وہ اپنی ازلی عداوت کی وجہ سے مسلمانوں کا اقتدار اور اثر ہر جگہ سے ختم کر کے اپنے جوع الارض کی سیری چاہتے تھے، اس کے لئے بہت سے حیلے بہانے تراشے، مگر فوری وجہ یہ تھی کہ جب گیارہویں صدی عیسوی میں مشرقی یورپ میں سلجوقیوں نے بڑھ کر یونانی علاقے اور ایشیائے کوچک پر اپنی حکومت قائم کر لی تو یورپ والوں کو پسند نہ آیا، تاریخ یورپ کے

مصنف اے۔ جی گرانٹ نے تو صاف طور پر لکھا ہے کہ یورپ کے مغربی اور مشرقی محاذوں پر مسلمانوں کا خطرہ بڑھ گیا تھا، سخت ضرورت تھی کہ ان کو پیچھے ہٹا دیا جائے (تاریخ یورپ، اردو ترجمہ ص ۵۳ - ۴۵۲)

دی کروسیڈ کے مصنف ٹی۔ اے۔ ارچر اور سی۔ ایل کنگسفورڈ نے تو بڑی صفائی سے لکھا ہے کہ اس صلیبی جنگ کی ضرورت اس لئے پڑی کہ عیسائیت کی فلاح کے لئے ترکوں کو یورپ کی طرف بڑھنے سے روکا جائے، گیارہویں صدی میں وہ بہت تیزی کے ساتھ یورپ کی طرف بڑھ رہے تھے، پہلی صلیبی جنگ کی وجہ سے ان کا سیلاب پیچھے کی طرف مڑ گیا، جو قسطنطنیہ کی طرف بڑھ رہا تھا، لیکن اس کے بعد دو صدیوں تک اسلام کی ضرورت سے زیادہ سرگرمیاں بروئے کار آ گئیں ..... اگر محمد ثانی نے قسطنطنیہ کی جو تسخیر کی وہ وہ تین صدی پہلے بھانپ لی جاتی تو پھر ترک، بلقان اور ڈینیوب کے زیریں علاقے ہی تک محدود نہ رہتے بلکہ یورپ کی طرف بڑھ کر دنیا کی تاریخ ہی بدل دیتے (ص ۵۰ - ۴۴۹)

یورپ کے جاگیردار اس جنگ میں اس امید کے ساتھ شریک ہوئے کہ اگر مشرق کے کسی علاقہ میں ان کی ریاستیں قائم ہو گئیں تو ان کو آزاد حکمراں کی حیثیت سے حکومت کرنے کا موقع ملے گا، ان کی یہ امید کسی حد تک پوری ہوئی جیسا کہ آگے ذکر آئے گا.

یورپ کے تاجروں نے بھی اس جنگ کو زیادہ ہوا دی، خصوصاً اٹلی کے تاجر مشرق میں اپنی تجارتی منڈی قائم کرنے کی خاطر ایسے مشرقی سواحل چاہتے تھے، جہاں ان کے تجارتی بیڑے پہونچ کر مشرق کے بازاروں پر چھا جائیں، اس غرض سے ان تاجروں نے اپنے اپنے جہاز دے کر صلیبیوں کی فوجی نقل و حرکت میں بڑی مدد پہونچائی، آگے کی تفصیل سے معلوم ہوگا کہ یورپ کے تاجروں کو ان لڑائیوں سے بڑے فوائد پہونچے (نیز دیکھو کروسیڈ از ارچر اینڈ کنگسفورڈ، ص ۳۰۱ - ۲۹۵، باب ۲۸)

یورپ کے کلیساؤں کی طرف سے اس جنگ کے لئے زیادہ جوش اور ہیجان پیدا کیا گیا، مگر اس میں بھی مذہبی جذبات کم، کلیسائی مفادات زیادہ مضمر تھے، اس زمانہ میں کلیسا کے اثرات بہت کم

ہوتے جارہے تھے، پوپ اربن دوم نے لوگوں کے مذہبی جذبات اس لئے ابھارے کہ اس کا مذہبی اقتدار
قائم ہو، اربن دوم کا اختلاف نہ صرف یونان کے امپائر بلکہ اس زمانہ کے انگلستان، جرمنی اور فرانس کے
حکمرانوں سے بہت بڑھ گیا تھا، اس نے اپنے کھوئے ہوئے اثرات کو بحال کرنے کے لئے صلیبی جنگ
کے نام پر ایک مذہبی جنون پیدا کر دیا، کلیسا کو مسلمانوں سے نظری دشمنی ہے، اس لئے ان کے خلاف ہر طرح
کی نفرت پھیلائی، اس کو ہوا پیٹر نے دی جس کے نام کا جزو ہرمٹ ہو گیا تھا، بہانہ یہ تراشا گیا کہ سلجوقی حکومت
بیت المقدس میں مسیحی زائرین کے ساتھ برا سلوک کرتی ہے، یورپ والوں کا طریقہ کار شروع سے یہ
رہا ہے کہ جب کسی کو وہ مورد الزام ٹھہرانا چاہتے ہیں تو پہلے اس کے مظالم اور بدعنوانیوں کی طرح طرح کی
داستانیں مشتہر کرتے ہیں، پھر حق و انصاف کے نام پر جارحانہ کارروائی شروع کر دیتے ہیں، یہی تاریخ
بیت المقدس میں دہرائی گئی، پوپ اربن دوم نے فرانس میں ایک کانفرنس منعقد کر کے یہ اعلان کیا کہ
جو شخص اس وقت صلیب نہ اٹھائے گا وہ میرا پیرو نہیں، اے۔ جی گرانٹ نے اس موقع کا ذکر کرتے ہوئے
لکھا ہے کہ اس زمانہ میں یہ دیوانہ پن تھا کہ پوپ جو کچھ کہتا اس پر تمام یورپ آمنّا و صدّقنا کہتا (تاریخ یورپ
اردو ترجمہ ص ۳۵۱)

پوپ نے ایک مجنونانہ جوش پیدا کر دیا تو اس کے حکم کو خدا کی مرضی سمجھ کر سرخ کپڑے کی صلیبیں اپنے
سینوں پر لگا کر ہر طرف کے عیسائی ایک مقدس جہاد کے لئے تیار ہو گئے، مگر اس میں شرکت کرنے والوں
کی نوعیت یورپ ہی کے مورخوں کے بیانات سے ظاہر ہو گی۔

صلیبی فوج کی نوعیت ایڈورڈ گبن نے لکھا ہے کہ صلیبی سپاہیوں نے صلیب کا سہارا ضرور لیا، لیکن ان میں
زیادہ تر ایسے تھے جو اس جنگ کے ذریعہ سے اپنی خواہشوں کی جنت آباد کرنے کے خواہاں تھے، ان کا
خیال تھا کہ مسلمان امراء کی دولت حاصل کر کے وہ بہت متمول ہو جائیں گے، ان کو اچھی سے اچھی شراب
اور حسین سے حسین عورتیں ملیں گی، اس جنگ میں شریک ہونے والوں میں وہ لوگ بھی تھے جو جاگیرداری

اور کلیسائی نظام سے آزردہ تھے، وہ کسان بھی تھے جو اپنے زمینی آقاؤں کے مظالم سے نجات چاہتے تھے
اور اپنی پسند کا ایک علاقہ چاہتے تھے، وہ راہب بھی تھے جو کلیسا کے جبر سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے
وہ مقروض لوگ بھی تھے جو اپنے قرض خواہوں سے نجات چاہتے تھے، وہ مجرم بھی تھے جو اپنے جرائم کی سزا سے
نجات چاہتے تھے (ہسٹری آف ڈکلائین اینڈ فال آف رومن امپائر، ج ۶، ص ۱۲-۱۱۴)

فرانسیسی مورخ لیبان کا بیان ہے کہ اس میں وہی لوگ شریک ہوئے جو مفلوک الحال اور ممنوع الارث
تھے، یا جنھیں جنگ کے ذریعہ دولت حاصل کرنے کی خواہش تھی، یا وہ راہب تھے جو خانقاہی زندگی کی سختیوں سے
عاجز آ گئے تھے (تمدن عرب اردو ترجمہ ص ۲۹۵)

ایچ۔ جی۔ ویلس نے صلیبی لڑائیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس جنگ میں جوش شعلہ زن ضرور
ہوا، لیکن اس میں ادنیٰ درجے کے جذبات بھی تھے، لاطینی گرجا کا مقصد تو یہ تھا کہ وہ بازنطینی گرجا کو اپنے زیر نگیں
کر لے، اٹلی میں کچھ لٹیرے ایسے بھی تھے جو اٹلی کو لوٹ کر برباد کر رہے تھے، وہ اپنی لوٹ کے لئے کچھ اور متمول
علاقے چاہتے تھے، غیر روادار سلجوقیوں اور فاطمیوں نے وینس اور جینوا کے تاجروں کے راستے روک رکھے تھے
جو بغداد اور مصر ہو کر یورپ میں تجارت کرتے تھے، وہ اپنی تجارت کے لئے قسطنطنیہ اور بحر اسود کے ذریعہ سے
راستے چاہتے تھے، پھر شمالی فرانس، مغربی جرمنی اور بوہیمیا کے علاقوں میں وبا پھوٹ پڑی تھی، وہاں بڑا معاشرتی اختلال تھا
اس لئے مشرق کی طرف لوگ اسی طرح چل کھڑے ہوئے جس طرح آج کل سونے کی کان کی دریافت پر
ہر قسم کے لوگ وہاں ٹوٹ پڑتے ہیں (دی آؤٹ لائن آف ہسٹری، ص ۶۴۱-۶۴۰)

فلپ کے ہٹی نے بھی اس جنگ کے شرکاء کا ذکر کر کے یہ لکھا ہے کہ صلیبی جنگ میں جن لوگوں نے
حصہ لیا وہ ان سب میں خالص مذہبی جذبات نہ تھے، ان کے کچھ سردار اپنے لئے علاقے چاہتے تھے، پیسا،
وینس اور جنیوا کے تاجروں کو اپنی تجارت سے دلچسپی تھی، رومان پسند، مضطرب اور مہم جو لوگوں کو مجتمع ہونے کا
موقع مل گیا، مجرموں نے سوچا کہ اس کے ذریعہ سے ان کی بخشائش ہو جائے گی، فرانس، لورین، اٹلی اور سسلی

کے عوام اپنے اقتصادی اور معاشرتی حالات سے بددل تھے، صلیب کو اٹھانے میں ان کو راحت محسوس ہوئی ان میں قربانی اور ایثار کا جذبہ نہ تھا (ہسٹری آف دی عربس، ص ۶۳۶)

ان صلیبی لڑائیوں کی معرکہ آرائیوں کی تفصیلات اور جزئیات کا مطالعہ کرنے کے بجائے یہ دیکھنا ہے کہ ان میں مسلمانوں اور عیسائیوں کا کردار کیسا رہا، اور یورپ میں ان کے سیاسی، معاشرتی، تمدنی، اقتصادی اور تجارتی اثرات کیا پڑے؟

مسلمانوں کا سیاسی انتشار پہلے کہا جا چکا ہے کہ سلجوقیوں کے حدود سلطنت میں اضافہ ہو رہا تھا تو یہ عیسائیوں کو گوارا نہیں تھا، کیونکہ یونانی خلافت بغداد کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر خود ایشیا میں اپنے اقتدار کے خواہاں ہو گئے تھے، دسویں صدی کے آخر تک بازنطینی حکومت کی سرحد جنوب میں ایطالیہ اور مشرق میں آرمینیا تک پہونچ گئی تھی، سلجوقی حکمراں طغرل نے اس توسیع پسندی کو روکا اور جب اس کے بعد اس کا بھتیجا الپ ارسلان اس کا جانشین ہوا تو جارجیا، آرمینیا اور آذربائجان کو واپس لیا، جس کے بعد یونانی حکمراں رومانس (ارمانوس) نے دو لاکھ فوج کے ساتھ الپ ارسلان سے ایک خوں ریز جنگ کی، مگر شکست کھا گیا اور گرفتار ہوا، اس نے زرفدیہ ادا کر کے اور اپنی دو لڑکیوں کی شادی الپ ارسلان کے لڑکوں سے کر کے رہائی حاصل کی، مگر یونانیوں نے خود اس کو تخت سے معزول کر دیا، الپ ارسلان نے ایشیائے کوچک کی حکومت اپنے چچازاد بھائی سلیمان کو دے دی جس نے نائس کو اپنا دار السلطنت بنا کر مغرب میں اپنی سرحد بحر قلزم تک بڑھا دی، اور بازنطینی حکمرانوں سے خراج بھی وصول کیا، الپ ارسلان کا جانشین ملک شاہ ہوا، جو نہ صرف سلجوقیوں بلکہ مسلمانوں کا ایک جلیل القدر حکمراں ہوا، اس کے وزیر نظام الملک کی وجہ سے اس کی حکومت کا وقار اور بھی بڑھا، مگر اس کی حکومت میں اسماعیلیوں یعنی حسن بن صباح کے فدائیوں کی سرگرمیوں کی وجہ سے بڑا خلل رہا، نظام الملک کا قتل ان ہی کے ہاتھوں ہوا، یونانی حکمراں الیکزیس تو اپنی لڑکی کو ملک شاہ کی زوجیت میں دینے کے لئے تیار ہو گیا تھا، مگر شادی سے پہلے اس کی وفات ہو گئی، ملک شاہ کے بعد اس کا لڑکا رکن الدین کے

لقب سے اس کا جانشین ہوا، مگر اس کا بھائی محمد بھی تخت کا دعویدار ہوا، جس کے بعد خوں ریز خانہ جنگی ہوئی، حسن بن صباح کے فدائیوں نے اس اختلاف سے فائدہ اٹھا کر شمالی ایران، عراق اور شام پر قبضہ کر لیا، اور سربرآوردہ مسلمانوں کو اپنے خنجروں سے یا تو ہلاک کیا یا ان کو اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کیا، جس سے سلجوقیوں کی حکومت اور بھی کمزور ہو گئی، خلافت بغداد بھی اس وقت زیادہ جاندار نہ تھی، خلیفہ مقتدی کی وفات کے بعد مستنجد باللہ تخت نشین ہوا، تو اس وقت اس کی عمر کل سولہ (۱۶) سال کی تھی۔

پہلی صلیبی جنگ ان ہی حالات میں صلیبی مجاہد ایشیا پر ٹوٹ پڑے، مگر اس مقدس جنگ میں وہ کس طرح آگے بڑھے اس کا مطالعہ کرنا بھی ضروری ہے، پہلے ذکر آیا ہے کہ ان مقدس مجاہدوں میں کون کون شریک تھے، پہلا جتھا والٹر گوتیر مفلس کی رہنمائی میں بڑھا، مگر یہ فوج جس علاقہ سے گذری مفت رسد حاصل کرنے کی خاطر لوٹ مار کرتی گئی، یہاں تک کہ بلغاریہ کے خود عیسائیوں نے ان کا قتل عام کیا، پیٹر دی ہرمٹ اپنی نگرانی میں چالیس ہزار کا دوسرا جتھا لے کر روانہ ہوا، راستہ میں اس نے بلغاریہ کے قتل عام کا پورا بدلہ لیا، جس سے ہنگری اور بلغاریہ کے علاقے ویران ہو گئے، وہ ایشیائے کوچک پہونچے تو انھوں نے دودھ پیتے بچوں کو قتل کیا اور ان کے جسم کے ٹکڑے ہوا میں بکھیرے، اس طرح وہ نائس تک پہونچ گئے، تیسرے جتھے کی رہنمائی ایک جرمن راہب نے کی جس کے ساتھ بقول گبن وحشیوں کی ایک بھیڑ تھی، وہ شراب پیتے، زنا کرتے اور لوٹتے مارتے آگے بڑھے تو ہنگری اور بلغراد والوں نے ان کا اتنا قتل عام کیا کہ میدانوں میں ان کی ہڈیاں ہی ہڈیاں نظر آتیں، چوتھا جتھا انگلستان، فرانس اور لورین سے روانہ ہوا، اس میں بھی ویسے ہی قماش کے وحشی لوگ تھے، راستے میں ان کو مسلمان نہیں ملے تو یہودیوں کو قتل کرنا شروع کیا، کولون میں ہزاروں یہودی تہ تیغ کیے گئے، اسی طرح دریائے رائین کے ساحل پر بھی ان یہودیوں کا قتل عام ہوا، اس جتھے کی بھی سرزنش ہنگری کی فوج نے اچھی طرح کی،

اس کے دوسرے سال یورپ کے جاگیرداروں کا جتھا گوڈفری کی نگرانی میں روانہ ہوا، قسطنطنیہ اور

نامیس ہوتا ہوا یہ انطاکیہ پہونچا تو اس کا سات مہینے تک محاصرہ کیا، کھانے پینے کی کمی ہوئی تو انسانوں کا گوشت کھانے لگے، اور جب انطاکیہ پر ان کا تسلط ہوا تو مسلمانوں کا قتل عام شروع کیا، دو ہزار ترکوں کے سر کاٹ کر فوجی کیمپ کے گرد نمایش کے لئے لٹکا دئے گئے، وہاں کی قبریں کھود کر لاشوں کو باہر نکالا جاتا اور ان کے اعزہ کو دکھا کر ان کو رونے کے لئے چھوڑ دیا جاتا، سلجوقی خاندان کے نوجوان ان کے والدین کے سامنے مارے جاتے، انسانیت سوز حرکتیں جتنی ہو سکتی تھیں وہ سب عمل میں آگئیں، عورتوں کی عصمت ریزی اور شراب نوشی کے ذلت آمیز فواحش سب دیکھنے میں آئے، ایک فرانسیسی مورخ لکھتا ہے کہ بابل کی وحشیانہ اور غیر انسانی حرکتیں ان مقدس مجاہدوں اور بیت المقدس کے نجات دہندوں کے ذریعے عمل میں آئیں، ان لاطینی وحشیوں کی وجہ سے عورتوں اور بچوں کو کہیں پناہ نہیں ملی، مسجدیں بے رحمانہ طریقے پر مسمار کی گئیں، ہر گھر مذبح خانہ بنا ہوا تھا، گلی کوچے میں خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں، دس ہزار آدمی موت کے گھاٹ اتارے گئے (یہ واقعات ایڈورڈ گبن کی ہسٹری آف دی ڈیک لائن اینڈ فال آف دی رومن امپائر ص ۴۳۱ - ۴۱۶، اور موسیو لیبان کی تمدن عرب ص ۹۶ - ۲۹۵ سے لئے گئے ہیں)

انطاکیہ سے یہ فوج شمالی شام کی طرف بڑھ کر معرۃ النعمان پہونچی، جہاں تین دن تک قتل عام کرتی رہی، ... لاکھ مسلمان قتل اور اسی قدر زندہ گرفتار کئے گئے، پھر یہ مقدس فوج بیت المقدس کی طرف بڑھی، اس جنگ کے آغاز میں بیت المقدس سلجوقیوں کے قبضہ میں تھا، مگر انطاکیہ پر صلیبیوں کا اقتدار قائم ہوا تو بیت المقدس مصر کی فاطمی حکومت نے اپنے ماتحت کرلیا، مگر جب صلیبی فوج نے اس کا محاصرہ کیا تو یہ حکومت بھی اس کو بچا نہ سکی جولائی ۱۰۹۹ء میں اس پر صلیبیوں کا قبضہ ہوگیا۔

عیسائیوں کے مظالم بیت المقدس کی فتح کے بعد عیسائیوں نے ایسے اندھے تعصب کا ثبوت دیا جس کی مثال گذشتہ تاریخ میں نہیں ملتی، گبن لکھتا ہے کہ صلیب کے علمبرداروں نے تین دن تک اتنا قتل عام کیا کہ ستر ہزار لاشوں کی وجہ سے وبا پھیل گئی، جب اس سے بھی ان کو تشفی نہیں ہوئی تو یہودیوں کو

ان کی عبادت گاہوں میں جلایا گیا (ص ۴۵۹) لیبان کا بیان ہے کہ یہ فوج بچوں، جوانوں اور بوڑھوں سب کو قتل کرتی رہی، چاروں طرف لاشیں دکھائی دیتیں، اس قدر خون بہا کہ لاشیں تیرتی پھرتی تھیں، بیت المقدس کے مسلمانوں کے علاوہ یہودی اور غیر مقلد عیسائیوں کا بھی قتل عام آٹھ روز تک ہوتا رہا، تقریباً ساٹھ ستر ہزار آدمی مارے گئے، لیبان یہ بھی لکھتا ہے کہ ان صلیبیوں کا برتاؤ اس مقدس شہر کے باشندوں کے ساتھ اس سے مختلف رہا جو حضرت عمرؓ نے کئی صدی پیشتر عیسائیوں کے ساتھ کیا تھا (تمدن عرب اردو ترجمہ ص ۹۹ - ۲۹۸)

لیبان یہاں تک لکھ گیا ہے کہ صلیبیوں کی تمام فوج کشیوں میں ان کے افعال بالکل رذیل ترین اور احمق ترین وحشیوں کے سے تھے، ان کا برتاؤ مشرکانہ جنگ کے ساتھ، دشمنوں کے ساتھ، بے قصور رعایا کے ساتھ، سپاہیوں کے ساتھ یکساں تھا۔ یعنی وہ سب کو بلا امتیاز لوٹتے اور قتل کرتے تھے، .. (تمدن عرب ص ۲۹۰) تاریخ یورپ کا مصنف اے. جی گرانٹ بیت المقدس پر صلیبیوں کی فتح پر تبصرہ کرتا ہوا لکھتا ہے کہ صلیبیوں کے نزدیک دشمن کو قتل کرنا خدا کی عبادت کے مساوی تھا، اسی لئے پوپ کو یہ تحریر بھیجی گئی کہ خدا ہمارے عجز و انکسار سے رام ہوگیا، اور ہمارے عجز و الحاح کے آٹھویں روز اس نے شہر کو دشمنوں سمیت ہمارے حوالہ کر دیا ..... اور اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ جو دشمن وہاں موجود تھے، ان کے ساتھ ہم نے کیا سلوک کیا، تو اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ جب ہمارے سپاہی حضرت سلیمانؑ کے معبد میں داخل ہوئے تو ان کے گھوڑوں کے گھٹنوں تک مسلمانوں کا خون تھا (تاریخ یورپ اردو ترجمہ ص ۳۵)، فلپ ہٹی نے بھی اس کی تصدیق یہ لکھ کر کی ہے کہ بیت المقدس کی فتح کے موقع پر بوڑھوں اور عورتوں کا قتل عام ہوا، لاشوں کے سر، ہاتھ اور پاؤں گلی کوچوں میں دکھائی دیتے (ص ۶۳۹)

صلیبیوں کے ان مظالم کی تفصیلات مل، ہیلم اور مچاڈ (میشو) کی تاریخوں میں بھی ملے گی، ان کے اقتباسات امیر علی نے اپنی کتاب ہسٹری آف دی سرسینز میں بکثرت دئے ہیں (ص ۳۲۰ - ۳۲۰)

اسی میں مچاؤڈ میشو ا کی تاریخ سے یہ اقتباس دیا گیا ہے کہ مسلمانوں کا قتل عام سڑکوں اور ان کے گھروں میں ہوا، بیت المقدس ان کے لئے پناہ کی جگہ نہیں رہی، کچھ تو فصیلوں پر سے کود کر موت سے بچے، کچھ محلوں، برجوں اور مسجدوں میں جا کر پناہ گزین ہوئے، مگر عیسائیوں نے ان کو وہاں بھی پناہ نہیں لینے دیا، عمر فاروق رضی کی مسجد صلیبیوں کے قبضہ میں تھی، یہاں مسلمانوں نے پناہ لے کر اس کی مدافعت کی، لیکن صلیبیوں نے یہاں بھی افسوسناک مظالم ڈھائے جس سے اس فتح کو ذلت حاصل ہوئی، پیادے اور سوار فراریوں کو ڈھونڈتے پھرتے، اس خوفناک منظر میں موت کی چیخ کے سوا کچھ نہیں سنائی دیتا، فاتحین لاشوں کو روندتے ہوئے فراریوں کا پیچھا کرتے، ریمنڈ نے ان واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس کا بیان ہے کہ مسجد کے چھجے کے نیچے گھٹنوں تک خون بہہ رہا تھا اور گھوڑوں کی لگام اس سے آلودہ ہو رہی تھی (ج ۱ ص ۲۳۶)

عیسائی ریاستوں کے مظالم اور ان کی سفاکی

اس صلیبی جنگ کا اصلی مقصد اس سے بھی ظاہر ہوگا کہ بیت المقدس کی فتح کے بعد عیسائیوں کی تین ریاستیں اس علاقہ میں قائم ہو گئیں، بولون کا شہزادہ بالڈون الرہا کا حکمراں ہوا، انطاکیہ، بوہمند کے قبضہ میں آیا، بیت المقدس پر گوڈفری کی حکومت قائم ہوئی، اس کے جانشین اس کی سرحدیں اضافہ کرتے رہے (فلپ ہٹی ص ۶۳۷ - ۶۳۹) موسیو لیبان نے ژاک دی ویٹری کے بطریق کی تاریخ بیت المقدس کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان صلیبی بادشاہوں کے جانشینوں میں سے شریر، بدوضع اور متبذل نسل کا سلسلہ چلا اور اس ارض مقدس میں سوا بداطوار، لامذہب، چور، زانی، باپ کے قاتل، دروغ حلفی کرنے والے، مسخروں، عیاش راہبوں اور بے حیا پادریوں کے سوا کوئی نہ تھا (تمدن عرب ص ۳۰۱)

بیت المقدس پر تصرف حاصل کرنے کے بعد چند سال کے اندر صلیبیوں نے فلسطین کا بڑا حصہ یعنی ساحل شام پر انطرطوس، عکہ، طرابلس الشرق اور صیدا پر قبضہ کر لیا (صلاح الدین از اسٹینلی لین پول اردو ترجمہ ص ۲۰) مسلمانوں میں صلیبیوں کی خونریزی اور غارتگری سے بے چینی ضرور پیدا ہوئی، لیکن وہ یورپ کی

طرح کوئی متحدہ محاذ قائم نہ کر سکے، اس وقت خلافت بغداد بے جان ہو رہی تھی، سلجوقی خانہ جنگی میں مبتلا تھے، اس سے فائدہ اٹھا کر صلیبیوں نے اپنی خوں ریزی اور سفاکی جاری رکھی، لین پول لکھتا ہے کہ صلیبیوں نے مسلمانوں پر زندگی تنگ کر دی، انھوں نے اپنے سرداروں کو اشتعال دیا کہ وہ مسلمانوں پر بلا وجہ اور بلا سبب لوٹ مار کے حملے اور دھاوے شروع کر دیں، بارہویں صدی کے پہلے ربع کے حالات میں ایک مسلمان مورخ لکھتا ہے کہ افرنجیوں کی تاخت و تاراج اور رہزنی روز بروز ترقی پکڑتی گئی، انھوں نے مسلمانوں کو ایسا نقصان پہونچایا جس کا بیان کرنا دشوار ہے، ان پر تباہی اور غارت گری انتہائی درجہ تک پہونچا دی، ان کی لوٹ مار کے یہ حملے دیار بکر میں آمد کے شہر تک پہونچے، انھوں نے قتل و غارت میں شیعہ یا سنی کسی کا لحاظ نہیں کیا، سب کو تہ تیغ کیا، عراق پہونچے تو مسلمانوں کے پاس جس قدر چاندی یا قیمتی چیزیں تھیں، سب لوٹ لیں، حران اور رقہ پہونچ کر انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ سخت بے حرمتی اور بے شرمی کے ظلم کئے، روزانہ انھیں موت کا جام پلاتے رہے، دمشق کو جس قدر راستے جاتے تھے، بند کر دئے، اور صرف وہ راستہ کھلا رکھا جو رحبہ اور صحرا میں سے جاتا تھا، افرنجی جہاں رہتے تھے، وہاں کے آس پاس کے شہروں سے ناجائز رقمیں محصول کہہ کر وصول کرتے تھے (صلاح الدین از لین پول اردو ترجمہ ص ۲۸ - ۲۹)

مسلمانوں کی ناکامی کے اسباب

صلیبیوں کو مسلمانوں پر فتح اس لئے حاصل ہوئی کہ مسلمانوں میں یکجہتی نہیں تھی، سلجوقی فرماں روا ملک شاہ کی وفات ہوئی تو پھر اس خاندان کو نظام الملک جیسا کوئی وزیر نہیں ملا جو ملک شاہ کے فرزندوں کے باہمی نزاع دور کر کے ان میں مصالحت کرا دیتا، سلجوقی شہزادے اپنے باہمی جھگڑوں کی وجہ سے تاج و تخت کو تلف کر رہے تھے، یہاں تک کہ جو بڑے بڑے سردار سلجوقی بادشاہوں کے ماتحت کام کر چکے تھے، خود مختار بننے کی فکر میں تھے، بقول لین پول ہر شخص ٹوٹے ہوئے تاج کے ٹکڑوں کے لئے دست و گریباں تھا، ایک ہمسایہ دوسرے ہمسایہ سے رشک رکھتا تھا، کوئی

صاحبِ ہمت ان میں ایسا نہ تھا جو سب کا سردار اور ہادی بن کر دشمن سے لڑنے کو تیار ہو جاتا ...... یہی
وقت تھا جب کہ یورپ والے فوج کشی کر کے اپنی کامیابی کو ممکن کر لیں۔ اگر اہلِ یورپ کا یہ حملہ ایک پشت
پہلے ہوتا تو سلجوقی ایسے نہ تھے کہ کوئی گھونسہ دکھاتا اور وہ چپ بیٹھے رہتے، یورپ کی یہی فوج کشی اگر ایک
پشت بعد پیش آتی تو عمادالدین اور نورالدین زنگی سلجوقیوں کے مقامات حکومت پر ایسے مستولی ہو چکے تھے
کہ وہ یورپ کے ان حملہ آوروں کو دھکے دے کر سمندر میں غرق کر دیتے (صلاح الدین ص ۲۱، اردو ترجمہ)

عمادالدین زنگی کے کارنامے

مسلمان صلیبیوں سے چھوٹی چھوٹی لڑائیاں لڑتے رہے، مگر صلیبی ان پر غالب رہتے،
مگر ان کا حوصلہ صلیبیوں کے خلاف موصل کے آتابکی خاندان کے فرماں رواؤں
عمادالدین زنگی اور نورالدین زنگی کے زمانہ میں بڑھا، بارہویں صدی عیسوی میں سلجوقی سلطنت کا بڑا حصہ
متفرق چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کے ہاتھوں میں چلا گیا، تو ان ہی میں زنگی موصل کا فرماں روا ہو گیا، وہ ملک شاہ
کے غلاموں میں سے ایک غلام کی اولاد میں سے تھا، شہزادوں کا اتالیق تھا، اس لئے آتابک (بمعنی
اتالیق) اس کو خطاب ملا، اسی خاندان سے عمادالدین زنگی تھا، اس میں غیر معمولی قسم کی سیاسی ہوشمندی
تھی، اس نے محسوس کیا کہ صلیبیوں کے خلاف مسلمانوں کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ متحد نہیں ہیں
اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم ہیں جن سے بڑا نقصان پہونچ رہا ہے، وہ اپنی ریاست کو بچانے کی خاطر
مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں سے مل بھی جاتے تھے، اس لئے وہ بوازیج، نصیبین، خابور اور حران جیسی
چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ختم کر کے شام کی طرف بڑھا اور وہاں بھی مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی کمزور ریاستوں
شلاً بیج، حمص، بزاعہ، حلب، حماۃ اور حمص وغیرہ تھیں، ان کو بھی ختم کیا، پھر فوج لے کر عیسائیوں کے قلعہ
اثارب پر زبردست حملہ کیا اور اس پر فتح پائی اور یہاں کے مسلمانوں کو ان کے مظالم سے نجات دلائی، مگر
مسلمانوں کی بدقسمتی ساتھ دیتی رہی، موصل میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو عمادالدین دس سال تک اسی میں الجھا
رہا، سنہ ۱۱۳۷ء میں وہ پھر شام کی طرف متوجہ ہوا، لیکن حمص کا مسلمان فرمانروا عیسائیوں سے مل گیا تو

عمادالدین زنگی　　دوسری طرف رخ کر کے قلعہ بعرین پہ حملہ آور ہوا، تمام فرنگی فرماں رواؤں نے
مل کر اس کا مقابلہ کیا، مگر ان کو شکست فاش ہوئی، لیکن پول لکھتا ہے کہ عمادالدین نے بعرین پر قبضہ
کر کے اس کے فرماں روا کے ساتھ بڑا شریفانہ برتاؤ کیا اور اسے شاہی خلعت عطا کیا اور قلعہ میں
جو افرنجی فوج تھی وہ نہایت خستہ اور پست ہمت ہو چکی تھی، اس کو بھی جنگی اعزاز و التزام کے ساتھ
قلعہ سے باہر جانے دیا (صلاح الدین ص ۴۷) مگر قسطنطنیہ کے فرماں روا نے بعرین کے قلعہ کو واپس
لینے کے لئے اس کے خلاف فوج کشی کی، دمشق کے مسلمان فرماں روا نے بھی اس کا ساتھ دیا، مگر جب
عمادالدین زنگی کا مقابلہ ہوا تو شکست کھا گیا، سنہ ۱۱۴۰ء میں عمادالدین زنگی نے دمشق کا محاصرہ کیا مگر اس کو
چھوڑ کر بعلبک پر قابض ہو گیا جو والی دمشق مجیر الدین آبق کے کارپرداز سلطنت معین الدین آنر کی جاگیر
میں تھا، وہ عمادالدین سے اتنا برہم ہوا کہ عیسائیوں سے مل گیا اور یروشلم کی حکومت کا باج گذار بن گیا تاکہ
وہ شام کو عمادالدین سے آزاد کرائے، مگر عمادالدین زنگی کے حوصلے بلند رہے، اس نے بڑھ کر سنہ ۱۱۴۴ء
میں عیسائیوں کے قلعہ الرہا پر قبضہ کر لیا جہاں مسلمانوں پر بڑے مظالم ہوئے تھے، اس انتقامی جذبہ
میں عمادالدین کی فوجوں نے عیسائیوں کا قتل عام کرنا شروع کیا، مگر جب عمادالدین خود شہر میں داخل
ہوا، تو اس کی شان و شوکت دیکھ کر متاثر ہوا، اس نے اپنی سپاہ کو غارتگری سے روکا اور حکم دیا کہ جن لوگوں
کو انھوں نے گرفتار کیا ہے، انھیں رہا کر دیں، لڑکے لڑکیاں یا جس قدر زر و مال انھوں نے لوٹا ہے،
ان سب پر سے اپنا قبضہ اٹھا لیں، باشندگان شہر میں جو زندہ بچے تھے انھیں آزاد کر کے ان کے
گھروں میں ان کو آباد کیا تاکہ شہر کی رونق اور خوشحالی میں کمی نہ ہو، شہر میں جو غارت گری ہوئی تھی
اس کی تلافی میں محبت اور توجہ کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا (صلاح الدین، ص ۵۲)
الرہا کی تسخیر بڑی اہم فتح تھی، یہ شہر لاطینی سلطنت کا بڑا اہم حصہ سمجھا جاتا تھا، اس سے عیسائیوں میں
بڑی بے چینی پیدا ہوئی، یورپ کی قومیں پھر متحد ہوئیں، اس کے بعد دوسری جنگ صلیبی کا سلسلہ شروع ہوا

مگر اس سے پہلے عماد الدین زنگی کو اس کے غلاموں نے ذاتی عناد کی وجہ سے قتل کر دیا، لین پول لکھتا ہے کہ عماد الدین بے شک مرچکا تھا لیکن وہ اپنی زندگی میں ایسے کام کر گیا تھا، جسے تمام نصرانی دنیا بھی مل کر نہ مٹا سکتی تھی (صلاح الدین ص ۴۴)

دوسری جنگ صلیبی اور نور الدین زنگی

عماد الدین زنگی کی وفات کے بعد اس کا لڑکا نور الدین اپنی موت تک برابر صلیبیوں سے معرکہ آرائی کرتا رہا۔ الرہا پر عیسائیوں نے پھر قبضہ کر لیا تھا، مگر نور الدین نے ان سے لڑ کر پھر اس کو واپس لیا۔ اور ان کے فوجی رہنما کورٹنی کے جوسلن کو گرفتار کر کے اندھا کر دیا۔ اس کے بعد الرہا کے علاقے اور شمالی سرحدوں سے عیسائیوں کی قوت کا استیصال ہو گیا (صلاح الدین ص ۵۰) مگر فرانس کے بادشاہ لوئی ہفتم اور جرمنی کے فرماں روا کانراڈ نے مل کر کئی لاکھ فوجیں پھر شام بھیجیں، اس مرتبہ معین الدین آنر نے صلیبیوں کا ساتھ نہیں دیا، پھر تو بقول لین پول یورپ کے بہادر سورما اپنے اپنے وطن واپس گئے (صلاح الدین ص ۵۰)

لیبان ایک قسیس انگی تل کی تاریخ کے حوالے سے لکھتا ہے کہ اس دوسری جنگ صلیبی میں بہت کم صلیبی ایسے تھے جن کے خیالات خالص مذہبی ہوں، کسی قسم کا گناہ، ظلم، لوٹ اور افعال قبیحہ ایسے نہیں ہیں جو ان کی طرف منسوب نہ کیے جاتے ہوں، سینٹ برنارڈ اس جنگ کی ناکامیابی کو ان ہی کے مظالم اور بے اعتدالیوں کی طرف منسوب کرتا ہے (تمدن عرب ص ۳۰۲) نور الدین کا سر اونچا ہوا تو شام کے عیسائی جوسلن کا انتقام لینے کی خاطر نور الدین کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، دلوک کی جنگ میں ان کو شکست فاش ہوئی، اس کے بعد دمشق پر بھی نور الدین کا قبضہ ہو گیا، وہاں کے عیسائیوں کو اختیار دیا گیا کہ ان میں سے جس کا دل جہاں چاہے جا سکتا ہے، شام میں نور الدین کی قوت بہت بڑھ گئی تو اس نے صلیبیوں کے خلاف انطاکیہ پر بھی یورش کی، جنھوں نے حارم کا نصف حصہ دے کر صلح کر لی۔

اس کے بعد صلیبیوں کی مدد کے لئے یورپ کی تازہ دم فوجیں پہونچیں، تو حمص و حماۃ وغیرہ کو تاراج کیا،

بانیاس کے فرماں روا ہمفری کی سرکردگی میں نور الدین سے ایک سخت جنگ کی، مگر ہمفری کو شکست ہوئی جس سے صلیبیوں کو بڑا صدمہ پہونچا، انطاکیہ، طرابلس اور لوسگنان کے عیسائی فرماں روا گرفتار ہو گئے، اور ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں (صلاح الدین ص ۷۳)

اس اثناء میں بیت المقدس کے فرنگی فرماں روا کی فوجوں نے مصر پر قبضہ کرنے کی کوشش کی، مگر ان کو ناکامی ہوئی تو انھوں نے مصریوں سے ساز باز کر کے مصر کے حکمراں اسد الدین کے خلاف فوج کشی کی مگر نور الدین اسد الدین کی مدد کو پہونچ گیا اور اس نے اسد الدین سے مل کر صلیبیوں کو شکست دی جس سے نہ صرف نور الدین کی فوج کا حوصلہ بڑھا، بلکہ اسد الدین کا اقتدار اسکندریہ تک بڑھ گیا، مگر جب مصری حکومت بے جان ہوئی تو اس نے صلیبیوں سے صلح کر لی جس کے بعد صلیبیوں نے مصر پر پورا قبضہ کرنے کی کوشش کی، مگر وہ اس پر قبضہ نہ کر سکے بلکہ مصری حکومت نور الدین کے ماتحت ہو گئی، نور الدین کے ممتاز فوجی سردار نجم الدین ایوب کا بیٹا صلاح الدین منصب وزارت پر مامور ہوا، پھر تو وہاں کا رنگ ہی بدل گیا۔

صلاح الدین کے بڑھتے ہوئے اقتدار اور نور الدین کے روز افزوں اثرات سے فرنگیوں میں بڑی تشویش پیدا ہوئی، شام کے قسیسوں اور راہبوں نے اعلان کیا کہ بیت المقدس خطرے میں ہے، شام کے صلیبیوں نے مصر کو اپنے اثر میں لینے کے خیال سے ۱۱۶۹ء میں دمیاط کا محاصرہ کر لیا، مگر صلاح الدین اور نور الدین کی ہوشمندی سے وہ ناکام واپس ہوئے، اس کے بعد مصری حکومت ختم ہو گئی تو اس پر صلاح الدین کا قبضہ ہو گیا۔

مسلمانوں کی تاریخ میں یہ المیہ بھی رہا ہے کہ جب طاقتور حکمراں ایک زمانہ میں ہوتے ہیں تو مل کر اغیار سے لڑنے کے بجائے خود متصادم ہو جاتے ہیں، نور الدین اور صلاح الدین میں اختلاف پیدا ہونے ہی والا تھا کہ نور الدین کی وفات ہو گئی۔

نورالدین کی وفات کے بعد اتابکی خاندان کے دو ٹکڑے ہو گئے، موصل پر اس کے بھتیجے سیف الدین غازی نے قبضہ کر لیا، بیت المقدس ابھی تک صلیبیوں کے قبضہ میں تھا، شام میں ان کی کئی حکومتیں قائم تھیں، پورا یورپ ان کی مدد کر رہا تھا، ضرورت اس کی تھی کہ مسلمان بھی متحد ہوتے مگر موصل کا فرماں روا صلاح الدین کے خلاف صلیبیوں سے مل گیا اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ نورالدین کا کمسن لڑکا الصالح اسمٰعیل اپنے امراء کے ہاتھوں میں کھلونا تھا، جو اپنی خود غرضی میں صلاح الدین کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے تھے، اس لئے وہ اس سے دور دور رہے۔

صلاح الدین ایوبی

صلیبیوں کا مقابلہ اب صرف صلاح الدین ایوبی ہی کر سکتا تھا، مگر اسلام کے اس سرفروش غازی اور مجاہد نہیں بلکہ اس کی ملت کی شومیٔ قسمت یہ تھی کہ خود اس کی ملت کے لوگ ان کے ساتھ یکجہتی پیدا کرنے کے بجائے اس کے مخالف رہے، موصل کا والی سیف الدین غازی اور دمشق کے امراء نے صلیبیوں سے مل کر اس کے خلاف سازش کی، لیکن اس کی ہوشمندی اور بیدار مغزی کام آئی، اس نے بڑھ کر دمشق، حمص، حماۃ، بعلبک پر اپنا اقتدار قائم کر لیا اور سیف الدین کو شکست دے کر بزاعہ اور عزاز وغیرہ پر بھی قبضہ کر لیا، صلاح الدین کی بڑھتی ہوئی قوت سے خوفزدہ ہو کر سسلی کے عیسائیوں نے دو سو جنگی بیڑے شام کی طرف روانہ کئے، مگر جب اسکندریہ پہونچے تو صلاح الدین ایوبی کی مدد سے وہاں کے باشندوں نے ان سے لڑ کر ان کو واپس جانے پر مجبور کیا، صلاح الدین کو اس موقع پر ہر قسم کی مدد ملنی چاہئے تھی، مگر خود مصر میں اس کے خلاف سازش جاری تھی اور باطنیوں نے تو اس پر قاتلانہ حملے کئے، سیف الدین کے جانشین عزالدین اور اس کے چچازاد بھائی عمادالدین نے اپنی مخالفت جاری رکھی، شام کے چھوٹے چھوٹے مسلم حکمراں بھی اس کے مخالف رہے، مگر صلاح الدین نے ان کا مقابلہ کامیابی سے کیا، اور سنجار اور حلب جیسے علاقے پر قابض ہو گیا۔

شام کے عیسائی فرماں روا ریجی نالڈ نے جزیرہ نمائے عرب پر فوج کشی کر کے مدینہ طیبہ میں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار مبارک اور مکہ معظمہ میں خانۂ کعبہ کو منہدم کرنا چاہا، مگر اس کو ناکامی ہوئی

(صلاح الدین ص ۱۵۲)

صلاح الدین اپنوں اور بیگانوں سے معرکہ آرائی کر کے مسلمانوں میں سپہ گری، پامردی، سرفروشی اور دینی حمیت کی ایسی روح پھونک دی کہ جب وہ مختلف جنگی کارروائیوں کے بعد ۱۱۸۷ء میں حطین میں صلیبیوں کے خلاف صف آرا ہوا تو اس نے اس جنگ میں فتح حاصل کر کے مسلمانوں کو ساری دنیا میں سرخرو کیا، صلیبیوں کو شکست فاش ہوئی اور ان کے تمام بڑے بڑے امراء اور حکمراں گرفتار کر لیے گئے، اس جنگ کے بعد کچھ اور معرکے ہوتے رہے، اس طرح نوے سال کے بعد ۱۱۸۷ء میں صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس صلیبیوں سے واپس لے لیا۔

صلاح الدین ایوبی کی رواداری

صلاح الدین جس فراخدلانہ اور روادارانہ انداز میں بیت المقدس کے اندر داخل ہوا، اس کی تعریف تمام یورپین مورخوں نے کی ہے، گبن لکھتا ہے کہ انصاف کا تقاضا ہے کہ اس ترک فاتح کی رحم دلی کی تعریف کی جائے، اس نے مفتوحوں کو کسی مصیبت اور پریشانی میں مبتلا نہیں ہونے دیا، وہ ان سے بھاری رقمیں وصول کر سکتا تھا، لیکن تیس ہزار کی رقم لے کر اس نے سترہ ہزار قیدیوں کو آزاد کیا، دو تین ہزار کو تو اس نے رحم کھا کر یونہی چھوڑ دیا، اس طرح قیدیوں کی تعداد گھٹ کر گیارہ سے چودہ ہزار تک رہ گئی، جب یروشلم کی ملکہ اس کے سامنے آئی تو اس نے اس سے نہ صرف انتہائی مہربانی سے باتیں کیں بلکہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اس نے جنگ کے یتیموں اور بیواؤں میں خیرات تقسیم کی، جنگ کے زخمیوں کے علاج اور دیکھ بھال کے لئے ہر طرح کی سہولتیں فراہم کیں، وہ قرآن کے دشمنوں کے ساتھ ہر طرح کی سختی سے پیش آنے میں حق بجانب تھا، مگر اس نے جس فیاضانہ رحمدلی کا ثبوت دیا، اس سے وہ نہ صرف تعریف و تحسین بلکہ محبت کئے جانے کا مستحق ہے۔

(ج ۶، ص ۵۰۰ - ۴۹۹)

لین پول لکھتا ہے کہ صلاح الدین نے کبھی پہلے اپنی تئیں ایسا عالی ظرف اور باہمت ثابت نہیں کیا تھا جیسا کہ اس موقع پر ثابت کیا جب کہ یروشلم مسلمانوں کے حوالے کیا جا رہا تھا، اس کی سپاہ اور معزز ذمہ دار افسروں نے شہر کے گلی کوچوں میں انتظام قائم کر رکھا تھا، یہ سپاہی اور افسر ہر قسم کی زیادتی کو روکتے تھے، اسی کا نتیجہ تھا کہ کسی عیسائی کو کوئی گزند نہیں پہونچا، شہر سے باہر جانے کے کل راستوں پر سلطان کا پہرہ تھا اور ایک نہایت معتبر امیر باب داؤد پر متعین تھا کہ زرِ فدیہ دینے والے شہر سے باہر کسی روک ٹوک کے بغیر چلے جائیں.

لین پول یہ بھی لکھتا ہے کہ بعض وقت ایسے غربا بھی آتے جو زرِ فدیہ ادا نہ کر سکتے تھے، مسلمان سپاہی اور تاجر جو بکثرت شہر میں آ گئے تھے وہ عیسائیوں کا مال اور اسباب خریدتے تھے تاکہ عیسائیوں کے پاس اتنا سرمایہ ہو جائے کہ وہ اپنی آزادی خرید سکیں، مسلمان فوجی سردار بھی اسی طرح کے نیک کام کرتے رہے، اسی کے ساتھ لین پول نے عیسائی مذہبی طبقے کا حال اس طرح لکھا ہے کہ تقدس مآب بطریق یروشلم اخلاق اور ایمان دونوں سے عاری تھا، اس نے گرجاؤں کی دولت سمیٹی، سونے کے پیالے اور آبِ مطہر رکھنے کا سامان حتی کہ مہدِ مسیح پر جو طلائی ظروف رہتے تھے اپنے قبضہ میں کر لیے، اس کے ساتھ اپنا ذاتی اندوختہ بھی بہت تھا سب کو محفوظ کیا، یہ جمع کی ہوئی دولت اتنی تھی کہ اگر چاہتا تو بہت سے غریب عیسائیوں کا زرِ فدیہ دے کر آزاد کرا دیتا، جب مسلمان امرا نے سلطان سے کہا کہ اس بے ایمان اور نالائق پادری کو لوٹ کا اتنا مال لے جانے سے روکا جائے تو سلطان صلاح الدین نے جواب دیا کہ میں جو قول دے چکا ہوں اس سے پھر نہیں سکتا، لین پول نے یہ بھی لکھا ہے کہ صلاح الدین کے بھائی العادل نے ایک ہزار غلام صلاح الدین سے مانگ کر آزاد کیے، پھر صلاح الدین نے خود شہر میں یہ منادی کرائی کہ تمام بوڑھے جن کے پاس زرِ فدیہ ادا کرنے کو نہیں آزاد کیے جاتے ہیں کہ جہاں چاہیں وہ جائیں، لین پول یہ بھی لکھتا ہے کہ جن عیسائی عورتوں کے شوہر مر چکے تھے انھیں صلاح الدین نے بلا کر خزانے سے

بافراط روپے دیے، جیسا کچھ ان کا مرتبہ اور درجہ تھا اس کے مطابق کسی کو زیادہ اور کسی کو کم دیا، اور وہ جہاں جہاں گئیں، اس عزت اور فیاضی کا چرچا کیا۔

اس کے بعد لین پول لکھتا ہے کہ سلطان صلاح الدین کے ان احسانات پر ہم غور کرتے ہیں تو وہ وحشیانہ حرکتیں یاد آتی ہیں جو شروع کے صلیبیوں نے ۱۰۹۹ء میں یروشلم کی فتح پر کی تھیں، جب گوڈ فرے اور تنکرو یروشلم کے کوچہ و بازار سے گذرے تو وہاں مردے پڑے اور جان بلب زخمی لوٹتے تھے، ان بے گناہ اور لاچار مسلمانوں کو صلیبیوں نے سخت اذیتیں دے کر مارا تھا، ان کو زندہ جلایا تھا، جہاں قدس کی چھتوں اور برجوں پر مسلمان پناہ لینے چڑھے تھے وہیں ان صلیبیوں نے انھیں اپنے تیروں سے چھید کر گرایا تھا، اور جہاں ان کے اسی قتل عام نے مسیحی دنیا کی عزت کو بٹہ لگایا تھا اور اس مقدس شہر کو ظلم و بدنامی کے رنگ میں انھوں نے رنگا تھا، جہاں رحم اور محبت کا وعظ جناب مسیحؑ نے سنایا تھا، اور فرمایا تھا کہ خیر و برکت والے وہ لوگ ہیں جو رحم کرتے ہیں (ص ۲۰۵ - ۲۰۲) لین پول نے یہ بھی لکھا ہے کہ سالزبری کے اسقف ہیوبرٹ والٹر نے صلاح الدین سے درخواست کی کہ تربتِ مسیح، بیت اللحم اور ناصرہ کی دینی خدمت میں شامی عیسائیوں کے ساتھ دو دو رومن کیتھولک پادریوں کو بھی شرکت کی اجازت دی جائے، تو اس نے منظور کیا اور تینوں مقامات پر رومن کیتھولک پادری مقرر کیے گئے (ص ۳۱۴) لین پول نے ایک اور تعجب یہ بھی لکھا ہے کہ جب صلاح الدین کرک کے محاصرہ میں تھا تو یروشلم کے فرماں روا کی سوتیلی بہن ازابیلا کی شادی کی تقریب میں وہاں جشن منایا جا رہا تھا، صلاح الدین نے اپنے اس دشمن کے پاس شادی کا کھانا بھیجا اور فوج کو حکم دیا کہ جس برج میں دولھا دلھن ہیں، ان پر تیر نہ پھینکے جائیں (ص ۲۰۵ - ۲۰۴)

تیسری صلیبی جنگ صلاح الدین نے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا تو یورپ میں غیظ و غضب کی لہر پھر اٹھی، جرمنی کا قیصر فریڈرک، انگلستان کا رچرڈ شیر دل، فرانس کا فلپ دوم، صقلیہ، آسٹریا اور برگنڈی وغیرہ کے آہن پوش فوجی سردار شام کی طرف امنڈ پڑے، اور یہ تیسری صلیبی جنگ پانچ برس تک

صلاح الدین کے خلاف ہوتی رہی، مگر صلاح الدین ہی ان پر بھاری رہا جب صلح ہوئی تو بیت المقدس اور دوسرے شہر تو مسلمانوں کے قبضہ میں رہے، صرف ساحل عکہ پر ایک مختصر سی ریاست عیسائیوں کے قبضہ میں تھی، اس جنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے اے۔ جے گرانٹ نے لکھا ہے کہ تیسری جنگ میں شہنشاہ فریڈرک بار بروسا شیر دل انگلستان اور فلپ دوم شاہ فرانس پوپ کے دباؤ سے اس جنگ میں ضرور شریک ہوئے، مگر ان میں نہ تو مذہب کا اثر تھا اور نہ مقاصد میں یکجہتی تھی، اسی لئے اس جنگ میں ان کو ناکامی ہوئی، شہنشاہ فریڈرک تو ایشیائے کوچک کی ایک ندی میں ڈوب گیا، شاہ انگلستان اور شاہ فرانس اثنائے راہ میں لڑتے رہے اور جب وہ شام پہونچے تو وہاں بھی ان کی یہی حالت رہی، وہاں ان کو چند فتوحات ضرور حاصل ہوئیں، مگر فلپ فرانس واپس جانا چاہتا تھا، کیونکہ اس کو صلاح الدین کی طرف سے اتنا خطرہ نہ تھا جتنا کہ رچرڈ کی روز افزوں قوت سے تھا، رچرڈ کچھ دن اور رہا اور اپنی شجاعت اور کمال سپہ گری کا جوہر دکھایا، مگر انسانیت میں وہ صلاح الدین کے معیار سے بہت گرا ہوا تھا، عکہ میں اس نے اپنے قیدیوں کو قتل کر دیا، برخلاف اس کے صلاح الدین نے یروشلم میں اسیران جنگ کو آزاد کر دیا۔

اتنا کچھ لکھنے کے بعد گرانٹ لکھتا ہے کہ رچرڈ کے حالات زندگی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صلیبیت کی تحریک محض لغو تھی، صلیبیوں پر مذہب کا اثر کم تھا، ان کے مذموم افعال سے کلیسا کی نیک نامی پر بھی حرف آتا تھا۔ (تاریخ یورپ ص ۶۰-۳۵۹)

گرانٹ رچرڈ شیر دل سے شاید اس لئے منحرف ہے کہ وہ صلاح الدین کے بھائی عادل سے اپنی بہن کی شادی کے لئے تیار ہو گیا تھا، گو یہ رشتہ قائم نہ ہو سکا (ڈکلائن اینڈ فال آف دی رومن امپائر از ایڈورڈ گبن ج ۶، ص ۵۰۸)

آرچر اور کنگسفورڈ نے بھی لکھا ہے کہ تیسری جنگ صلیبی میں صلیبیوں کو شکست محض ان کی باہمی نااتفاقی کی وجہ سے ہوئی، فرانسیسی برابر اس فکر میں رہے کہ انگلستان کے بادشاہ رچرڈ کو

ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، رچرڈ برابر سوچتا تھا کہ فلپ اگر فرانس واپس چلا جائے تو زیادہ اچھا ہے، اس جنگ کے بعد مغرب سے اتنی بڑی فوج اور اتنے بڑے بہادر فوجی سردار پھر کبھی نہیں آئے لیکن باہمی اختلاف و رقابت اور ذاتی مفاد کی وجہ سے تیسری جنگ میں تباہی آئی، اور یہی چیزیں یروشلم کی لاطینی حکومت کے ساتھ برابر لگی رہیں (کروسیڈ ص ۳۴۸)

چوتھی صلیبی جنگ

گرانٹ لکھتا ہے کہ دوسری اور تیسری صلیبی لڑائیوں سے کوئی اہم نتائج مترتب نہیں ہوئے، مگر چوتھی جنگ کو یورپ کی تاریخ میں خاص اہمیت حاصل ہے، یہ اہمیت مسلمانوں کو مغلوب کرنے کی وجہ سے حاصل نہیں ہوئی، بلکہ اس جنگ سے یورپ کی صورت حال بدل گئی، پوپ انوسینٹ سوم نے یورپ کو پھر صلیبی جنگ کے لئے ابھارا تو اس میں زیادہ تر فرانس کے امرا شریک ہوئے، اور جب وہ یہ مقدس فوج لے کر وینس پہونچے تاکہ وہاں کے جہازوں پر سوار ہو کر شام کے ساحل پر اتریں، تو وینس کے تاجروں کو اس مقدس جنگ سے زیادہ اپنی تجارت کی فکر ہوئی، انھوں نے ان صلیبی لڑائیوں میں مشرق کی تمام بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا تھا، اور قسطنطنیہ تک ان کی تجارت پھیلی ہوئی تھی، مگر اس تجارت میں ان کا رقیب زارا کا شہر تھا جو اڈریاٹک کے مشرقی ساحل پر واقع تھا، وینس کے تاجروں نے صلیبیوں کو جہاز اس شرط پر دینا منظور کیا کہ وہ زارا کو فتح کر کے وینس کے ماتحت کر دیں، صلیبی اس کے لئے تیار ہو گئے، زارا فتح کر لیا گیا، گو پوپ کو دکھ ہوا کہ صلیبی خود ایک مسیحی شہر پر حملہ آور ہوئے، مگر صلیبیوں نے پوپ کی مرضی کے خلاف یہ اقدام کر ہی لیا، اور جب وہ شام کی طرف بڑھے تو قسطنطنیہ کے شہنشاہ کا بھتیجا الیگزیس اپنے چچا کے خلاف صلیبیوں سے فوجی امداد کا طلبگار ہوا، اس نے وینس کے تاجروں کو ہر قسم کی مراعات دینے، صلیبیوں کو خاطر خواہ معاوضہ عطا کرنے اور مشرقی اور مغربی کلیساؤں کو متحد کر دینے کا سبز باغ دکھایا، گرانٹ لکھتا ہے کہ صلیبیوں کو مذہب کا پاس کب تھا، وہ سپاہی جنھوں نے مسلمانوں سے لڑنے کا حلف اٹھایا تھا اور صلیب کا نشان لگائے ہوئے پھر ایک دوسرے مسیحی شہر پر حملہ آور ہونے کے لئے روانہ ہو گئے اور اس شہر کو اس طرح لوٹا کہ جب سے دنیا

وجود میں آئی ہے، کوئی شہر اس بری طرح سے نہیں لوٹا گیا، صلیبیوں کی جماعت ہی میں سے فلانڈرس کا رئیس بالڈون یہاں کا شہنشاہ بنایا گیا، وینس کے تاجروں نے ہر قسم کی رعایتیں حاصل کیں، گرانٹ لکھتا ہے کہ یہاں کی شہنشاہی اس طرح کمزور ہوگئی کہ ۱۴۵۳ء میں یہ ترکوں کے قبضہ میں ہوگیا (تاریخ یورپ ص ۶۲-۳۶۱)

صلیبیوں کی تھوڑی سی فوج فلسطین پہونچی، العادل سے برسر پیکار ہوئی تو اس نے تھوڑی رعایتیں دیں، مگر ان کا فوجی سردار رچی نالڈ انطاکیہ کے حکمراں بویمند سے مل کر نئی جنگ کرنے کی خاطر اس کی طرف روانہ ہوا، تو اس کی فوج غنیموں سے گھر کر بالکل تباہ ہوگئی۔ (کریسیڈ از ارچر اینڈ کنگسفورڈ ص ۳۷۱)

گرانٹ لکھتا ہے کہ اس اندوہناک مہم کے بعد صلیبی لڑائیوں کا زمانہ ختم ہوجاتا ہے اور چوتھی جنگ کے بعد ان جنگوں کی صحیح تعداد معلوم کرنا بھی دشوار ہے، کیونکہ پاپایانِ روم نے یہ قبیح عادت اختیار کرلی تھی کہ جس جنگ سے انھیں سروکار ہوتا اسے وہ صلیبی قرار دیتے تھے، ان کے کہنے پر جو فوجی مہمیں روانہ کی گئیں وہ بڑے پیمانہ پر نہ تھیں، فرانسیسی مورخ لیبان اور انگریز مورخ گرانٹ نے بقیہ اور لڑائیوں کا حال مختصر طریقہ پر اس طرح لکھا ہے:

پانچویں صلیبی جنگ بیت المقدس پر چڑھائی کرنے کے عوض میں اکثر صلیبی لوٹ کی امید میں مصر کی طرف روانہ ہوئے، لیکن زیادہ دور نہ جاسکے، شکست کھاکر پلٹ آئے (تمدن عرب ص ۳۰۴)

چھٹی صلیبی جنگ جرمنی اور نیپلز کا شہنشاہ فریڈرک دوم پوپ کے ایما سے ۱۲۲۹ء میں یروشلم گیا، چند روز کے بعد واپس گیا تو پوپ نے اسے کلیسا سے خارج کردیا، لیکن وہ دوسری مرتبہ پھر بیت المقدس پہونچا، اس کے تعلقات مسلمانوں سے خوشگوار تھے، اس لئے اس نے مصر کے سلطان سے فلسطین میں مسیحی زائروں کے داخل ہونے کی اجازت حاصل کرلی اور ایک دفاعی معاہدہ بھی کرلیا، یہ اس کی بڑی کامیابی تھی مگر پوپ اس سے خوش نہیں ہوا، اس کی ریاست نیپلز کو بھی کلیسا سے خارج کردیا (تاریخ یورپ ص ۳۶۳)

ساتویں صلیبی جنگ ۱۲۴۴ء میں سلطان مصر نے بیت المقدس پر اپنا مکمل قبضہ کرکے تمام مسیحی فوجوں کو شام سے نکال دیا، تو فرانس کا سینٹ لوئی پچاس ہزار فوج کے ساتھ بیت المقدس کی طرف روانہ ہوا، اس نے دمیاط فتح کرکے قاہرہ کی طرف پیش قدمی کی، مگر منصورہ میں مسلمانوں نے اس کو بری طرح شکست دی، مسیحی فوج کی ایک قلیل تعداد بچ کر ساحل کی طرف روانہ ہوئی، مگر بیماری اور دشمن کے حملوں سے تنگ آکر سینٹ لوئی نے ہتھیار ڈال دئے اور قید ہوگیا، فدیہ دے کر رہا ہوا . . . .

(تمدن عرب ص ۳۰۵)

آٹھویں صلیبی جنگ سینٹ لوئی ہمت نہ ہارا، سوا سال کے بعد اس نے ایک نئی جنگ صلیبی کا ارادہ کیا، جولائی سنہ ۱۲۷۰ء میں تیس ہزار پیدل اور چھ ہزار سوار لے کر ایک مارت سے روانہ ہوا، ٹیونس کی طرف اس امید موہوم کے ساتھ بڑھا کہ وہاں کے حاکم کو عیسائی بنائے، مگر اس شہر کے محاصرہ میں طاعون کے مرض سے مرگیا اور اس کی فوج بھی اس وبا کی نذر ہوگئی، اس کے بعد حقیقی صلیبی جنگ کا خاتمہ ہوگیا،

گرانٹ لکھتا ہے کہ اس کے بعد صلیبی جنگ کی متعدد تحریکیں ہوئیں مگر ان کا اطلاق صلیبی جنگ پر نہیں ہوتا، یورپ میں اس صدا پر کوئی لبیک کہنے کو تیار نہیں ہوا، دنیاوی لڑائیوں کو جو حرص و ہوا اور انتقام پر مبنی تھیں، مذہبی قرار دینے سے کلیسا کا رہا سہا بھرم بھی جاتا رہا (تاریخ یورپ ص ۳۶۵)

ہم نے اوپر صلیبی لڑائیوں کی کہانی زیادہ تر یوروپی مصنفوں کی زبانی بیان کی ہے، تاکہ ایک مسلمان اہل قلم کے جذبات میں جانبدارانہ رنگ نہ پیدا ہونے پائے، آیندہ اب ان لڑائیوں کے مختلف قسم کے اثرات کو بھی ان ہی یوروپی مصنفوں کی تحریروں کی روشنی میں دکھانا ہے،

سیاسی اثرات صلیبی لڑائیوں سے یورپ پر مختلف قسم کے سیاسی اثرات پڑے، فرانس تو براہ راست متاثر ہوا، وہاں کے بڑے بڑے جاگیردار ان لڑائیوں میں شریک ہوئے تو یا تو وہ

وہاں مارے گئے، یا وہ وہیں چھوٹے چھوٹے علاقے لے کر آباد ہوگئے، وہ فرانس سے گئے تو اپنی جاگیروں کے مالکانہ حقوق شہروں کے ہاتھ فروخت کر گئے، جن کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی خود مختار حکومتیں بن گئیں، مگر وہ بادشاہ کے ماتحت رہیں، پھر ان شہروں میں مجالس بلدیہ قائم ہوگئیں تو یہ شہر ان جاگیرداروں کے دائرۂ اثر سے باہر ہو گئے، اور وہ براہ راست بادشاہ کے ماتحت ہو گئے جس سے بادشاہ کا تسلط روز بروز ان پر بڑھتا گیا، اور جاگیر داری نظام رفتہ رفتہ بالکل ختم ہوگیا، یہی صورت حال اٹلی میں پیدا ہوئی، مگر انگلستان میں اس سے مختلف صورت پیدا ہوئی، وہاں جاگیر دار کم اور بادشاہ زیادہ صلیبی جنگ میں مشغول رہے، بادشاہ کی عدم موجودگی میں انگلستان کے امراء نے اپنے اثرات زیادہ پیدا کر لئے، ان کے اثرات اتنے بڑھے کہ آیندہ چل کر وہ بالکل محض دستوری حکمراں بنتے چلے گئے۔ (تمدن عرب اردو، ص ٣١٠ - ٣٠٩)

صلیبی مسلمانوں کی یکجائی کو درہم برہم کرنے پر تُلے ہوئے تھے، مگر خود بھی انتشار میں مبتلا ہوگئے، ان لڑائیوں میں مختلف ملکوں کے لوگ شریک ہوئے تو راستے ہی میں علیحدہ علیحدہ بولنے والوں کی ٹولیاں الگ ہونے لگیں، اس طرح فرانس اور جرمنی کے صلیبیوں میں اختلاف ہوا، جو دوسری جنگ میں اتنا بڑھا کہ ان کو شکست کا سامنا کرنا پڑا، تیسری جنگ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں میں اس اختلاف میں اتنا اضافہ ہوا کہ انگریز اور فرانسیسی ایک دوسرے کی کامیابیوں کو برداشت نہیں کر سکے، فرانس کے بادشاہ کو وطن لوٹنا پڑا، جس کے بعد انگلستان اور فرانس کی کشمکش اندر اندر بڑھتی گئی جو ایک صدی تک جاری رہی۔

(کروسیڈ از ارچر کنگسفورڈ ص ٢٤٣)

(باقی)

قرآن کریم
اور
اس کی نسبت سے بعض علوم کی ایجاد وترقی[1]

از

ڈاکٹر نذیر احمد، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

قرآن کریم اللہ کا کلام ہے جس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لی ہے،

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ	ہم نے اس کو نازل کیا اور ہم اس کے
وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (حجر۔ ٩)	محافظ ہیں۔

اور اللہ کا یہ قول حرف بحرف راست و درست ثابت ہوا، یہ کلام آج تک اس طرح محفوظ ہے کہ اس کتاب کے ایک نقطہ، شوشے یا حرکت میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہوا، قرآن عظیم کے لاکھوں قلمی اور مطبوعہ نسخوں کی یہ حیرت انگیز یکسانی ایک زندہ اعجاز ہے، واضح رہے کہ دنیا میں کسی کتاب کے اتنے قلمی نسخے نہیں ملتے جتنے قرآن کے ہیں اور یہ بات بدیہی ہے کہ قلمی نسخوں کی کثرت اصل متن کے تحریف کی دلیل ہوتی ہے لیکن قرآن کے اس کلیے سے استثنائی صورت دنیائے علم کے لئے موجب حیرت اور بصیرت ہے متن کی یہی محیر العقول یکسانی قرآن عظیم کے دوام پر دلیل اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ختم المرسلین ہونے کی بین شہادت ہے

---

[1] یہ مضمون شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی کے ایک جلسے میں پیش کیا گیا تھا،

قرآن قیامت تک کے لیے ہر قوم کے لیے شمع ہدایت ہے، یہ آج بھی اسی طرح قابلِ عمل ہے جیسا
ہزار سال پہلے تھا اور ان شاء اللہ ہزاروں سال بعد بھی رہے گا، یہ کتاب اہلِ علم و دانش کے لئے
غور و فکر کا نہایت وسیع سرمایہ اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدم قدم پر اس میں غور
و فکر کی دعوت دی گئی ہے، یہ دعوت کسی ایک زمانہ کے لئے نہیں، اس دعوت میں ہر ایک دور کے اہلِ بصیرت
کے لئے سرمایہ فکر موجود ہے، اس سے صریح نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زمانے کے ہر دور میں اس کے مطالب پر
غور و فکر کرنا واجب ہے، آج سائنس اور ٹکنالوجی کا دور ہے اور بڑے سے بڑے سائنسٹ ان
کے لئے اس میں روشنی و ہدایت کا سامان موجود ہے، آنے والے ادوار میں کن کن علوم کا زور ہوگا
کوئی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا معلوم ہے کہ مستقبل کا انسان فطرت کے بہت سے سربستہ راز
کھول چکا ہوگا، اس کو آسمان کے بعض حقائق کا علم ہو چکا ہوگا، تحت الثریٰ کے خزانے تک اس کی رسائی
کا بخوبی امکان ہے، وہ نئی معلومات کی روشنی میں قرآن کی نئی تعبیر و توجیہ کرے گا اور اس سے اس کے ذوقِ
علم کو تسکین و تشفی حاصل ہوگی لیکن یہ بات واضح ہے کہ ہماری ساری توضیحات اس کے لئے قابلِ قبول
نہ ہوں گی۔

بالفاظِ دیگر قرآن پر غور و فکر کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہے گا، علوم کی کثرت
اور رموزِ کائنات کی پردہ کشائی کی بنا پر اس عظیم کتاب کے
حقائق اور کھل کر سامنے آئیں گے، نئی تعبیر و توجیہ سے[1] ہراساں نہ ہونا چاہئے، قرآن علم کے بے پناہ وسائل

[1] "قرآن اور عصری تحقیقات" کے عنوان سے ایک مضمون پاکستان میں شائع ہوا ہے، اس کے
یہ جملے کس قدر بلیغ اور حقائق پر مبنی ہیں۔

"قرآن خدا کا قول ہے اور کائنات خدا کا فعل، سائنس کائنات کے اصولوں کو مادی
طور پر سمجھنے کی کوشش کا نام ہے، پس سائنس کی دریافت اور قرآن کی صحیح تفسیر میں تضاد

کی نشاندہی کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جتنا علم بڑھتا جائے گا، قرآن کی عظمت کا احساس و یقین زیادہ ہوتا
جائے گا، حال ہی میں ایک نوجوان سائنس داں ڈاکٹر راشد خلیفہ نے کمپیوٹر کی مدد سے قرآن کی بعض
حیثیات کا مطالعہ کیا ہے، اس سے دلچسپ اور سود مند نتائج برآمد ہوئے ہیں اس سے یہ معلوم ہوا
کہ قرآن ریاضی کے اعتبار سے ایک معجزہ ہے، آپ میں بعض حضرات نے قاضی ارشد مسعود صاحب کا مضمون
"قرآن کریم۔ ریاضی کا معجزہ" الجمعیت عید نمبر ۱۴ اگست سنہ ۱۹۷۹ء میں دیکھا ہوگا
یہ مضمون دراصل خلیفہ ارشد مسعود کی کتاب: The Perhetnal Meracle of Muhammad
کے ایک خلاصہ "Al Quran. The ultimete Meracle" پر مبنی ہے۔

اس آخری کتاب کے مرتب احمد دیدات ہیں، یہ ڈربن میں چھپی ہے اور مفت تقسیم ہوتی ہے، ان کے بیان
کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن میں استعمال شدہ الفاظ اور ان کے حروف اس نظم کے ساتھ مرتب ہیں کہ ان میں
ذرہ برابر تبدیلی سے تنظیم و ترتیب کا یہ محیر العقول سلسلہ درہم برہم ہو جاتا ہے، یہ مطالعہ قرآن کے اعجاز پر
دلیل قطعی ہے، ان مصنفین کا بیان ہے کہ قرآن میں ۱۹ کے ہندسے کی غیر معمولی کارفرمائی ہے، قرآن میں کل
۱۱۴ سورتیں ہیں اور یہ تعداد ۱۹ سے تقسیم ہو جاتی ہے، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۱۱۴ بار آتا ہے، ۱۱۳ بار سورتوں
میں اور ایک بار سورہ نمل میں ہے، ۱۱۴ میں ۱۹ پانچ بار شامل ہے، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں شامل
سارے الفاظ ۱۹ سے تقسیم پذیر ہیں، اس طرح پر کہ اسم = ۱۹ بار آیا ہے، اللہ = ۲۶۹۸ بار جس
میں ۱۹، ۱۴۲ بار شامل ہے، الرحمٰن ۵۷ بار، الرحیم ۱۱۴ بار، حروفِ مقطعات ۱۴، ان میں
حروفِ تہجی ۱۴ اور جن سورتوں میں حروفِ مقطعات آئے ہیں، ان کی تعداد ۲۹، میزان ۵۷،
جو ۱۹ سے تقسیم پذیر ہے، الم ۸ سورتوں میں آیا ہے، ان سب سورتوں میں الف، لام اور میم

بقیہ نوٹ ۳۵۰ کا کوئی سوال نہیں اس لیے کہ خدا کے قول اور عمل میں تضاد نہیں ہو سکتا،
تضاد اور غلط فہمی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ خود ہمارا علم ناقص ہو،

کی مجموعی تعداد ۲۶۶۷۷ ہے جو ۱۹ کو ۱۴۰۴ سے ضرب دینے سے حاصل ہوتی ہے، سورۂ قلم میں ن ۱۳۳ بار آیا ہے جو ۱۹ سے تقسیم ہوجاتا ہے، ق سورۂ "ق" میں ۵۷ بار آیا ہے، اس کی تیرہویں آیت میں اخوان لوط ہے، اگر اس کی جگہ قوم لوط آتا تو ق کی تعداد ۵۸ ہوجاتی اور ۱۹ کی ترتیب بگڑ جاتی، حرف ص، ایک بار مقطعات کی صورت میں تنہا اور دو بار سورۂ اعراف اور سورۂ مریم کے ابتدا کے دو حرف مقطعات یعنی المص، اور کہیعص میں آیا ہے ان تین سورتوں میں ص کی تعداد ۱۵۲ ہوتی ہے یہ تعداد ۱۹ سے تقسیم پذیر ہے، سورۂ اعراف کی ۶۹ ویں آیت میں بسطہ کو ص سے لکھا گیا ہے حالانکہ اصل املا س سے ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ کی ۲۴۷ ویں آیت میں ہے اگر بسطہ س سے لکھا جاتا تو ص کی تعداد ایک کم ہوجاتی یعنی ۹۷، اور اس طرح ص کی کل میزان جو ۱۵۲ ہوتی ہے ۱۵۱ رہ جاتی اور یہ عدد ۱۹ سے تقسیم نہیں ہوتا۔ سورہ اعراف میں حروف مقطعات میں الف۔ لام۔ میم۔ صاد حروف تہجی ہیں، ان کی تعداد اس طرح پر ہے:

الف :	۲۵۸۲
لام :	۱۵۲۳
میم	۱۱۶۵
صاد	۹۸
میزان کل =	۵۳۵۸

اس کو ۱۹ سے تقسیم دینے پر خارج قسمت ۲۸۲ آتا ہے۔ کھیعص، یہ حروف مقطعات سورہ مریم کے شروع میں آئے ہیں،

اس صورت میں ک کی تعداد :	۱۲۷
ھا	۱۶۸
یا	۲۴۵

ع :	۱۲۲
ص :	۳۶
میزان =	۷۹۸

اس میں ۱۹، ۴۲ بار شامل ہے،

ایک عجیب حقیقت کا انکشاف کمپیوٹر سے ہوا کہ ایسی کتاب جو اس طرح کے حیرت انگیز نظم و ترتیب سے مرتب ہو کسی انسانی کوشش سے مرتب نہیں ہوسکتی، اس میں امکانی پہلو ۶۲۶ کھرب کے مقابلے میں صرف ایک ہے

میرا اپنا ذاتی خیال ہے کہ آئندہ بھی اس سے بڑے سائنسی تجربات قرآن کے اوپر کے جائیں گے اور ان سے اس سے زیادہ حیرت خیز نتائج بر آمد ہوں گے۔

قرآن ماضی کے بعض واقعات کی طرف واضح طور پر اشارہ کرتا ہے، قوموں کے عروج و زوال سے انسانوں کو عبرت کی تعلیم دیتا ہے، کبھی قوموں کو ان کے غلط افعال کی وجہ سے ایسی سزا دیتا ہے کہ ان کا کوئی نام و نشان باقی نہیں چھوڑتا کبھی کبھی کچھ نشان اہل ایمان کی بصیرت کے لئے باقی چھوڑ دیتا ہے، جو بستیاں منقلب کردی گئی ہیں ان کو دیکھنے اور ان سے عبرت حاصل کرنے کا حکم دیتا ہے، یہیں سے تاریخ کی عظمت اور علم باستان شناسی کی اہمیت ثابت ہوتی ہے، حال ہی میں اطالوی باستان شناسوں کی ایک جماعت نے شام میں ایک شہر کا پتہ چلایا ہے جس میں ایک خوش حال قوم بستی تھی، یہ قوم سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے کئی سو سال تک اس خطے پر اپنا اقتدار قائم کئے ہوئے تھی، دو سال قبل اس نئی دریافت کے بارے میں ایک اطلاع معاصر جریدہ ہندوستان ٹائمز میں چھپی تھی، ۱۹ر مارچ سنہ ۱۹۷۹ء کے جریدہ "ہندو" کے میگزین والے حصے میں نیویارک ٹائمز کے حوالے سے ایک تفصیلی یادداشت شائع ہوئی، اس کا ایک اقتباس بعض لحاظ

سے اہم ہے،

حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے یعنی آج سے تقریباً ساڑھے چار ہزار سال قبل شام کا شہر "ابلا" نہایت اہم تجارتی، سیاسی اور تہذیبی مرکز تھا، اس کا ثبوت شاہی محل کے آرکائیوز سے حاصل کی ہوئی اطلاعات سے فراہم ہوتا ہے،

بادشاہ کا انتخاب ۷ سال کے لئے ہوتا، وہ ایک نمایندہ کاونسل کی مدد سے حکومت کرتا تھا شکست خوردہ شاہی امیدوار پنشن کا مستحق ہوتا تھا۔

ابلا میں بین الاقوامی کانفرنس بھی ہوتی، شاہی محل کے آرکائیوز میں بعض کانفرنسوں کی روداد ملی ہے،

ابلا کے تعلیمی اداروں میں غیر ملکی استاد اور شاگرد موجود تھے،

مملکت کا مرکز ابلا تھا، اس کی آبادی تیس ہزار تھی، ان میں گیارہ ہزار سات سو سرکاری ملازم تھے

پوری مملکت کی آبادی دو لاکھ ساٹھ ہزار تھی،

ابلا میں ایک اکاڈمی تھی جس میں ملکی اور غیر ملکی دانشور موجود تھے، ان کو خط میخی کی تعلیم دی جاتی تھی،

ابلا کی کھدائی ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۶ء تک روم یونیورسٹی کے باستان شناسی کے پروفیسر Paolo Mathias کی نگرانی میں عمل میں آئی، کھدائی میں ۱۵ ہزار مٹی کی تختیاں برآمد ہوئیں، جن پر سمیری طرز کے خط میخی میں لکھی ہوئی تحریریں ملتی ہیں، محققین کا خیال ہے کہ یہ سامی زبان کی قدیم شکل ہے، یہ تحریریں ادبی متن سے لے کر سفیروں کے اخراجات کی تفصیل اور تجارتی سامان کی فہرست تک کو حاوی ہیں۔ ان میں متعدد فہرستیں ہیں جن میں پیغمبروں، بادشاہوں اور دوسرے پیشہ وروں کے نام ملتے ہیں، ان میں ۶۰ ناموں کی صحیح قرأت ہو چکی ہے، ان ناموں کے علاوہ پودوں، معدنیات، چڑیوں، مچھلیوں وغیرہ کے نام ملتے ہیں، بعض تختیاں

قواعد زبان کے مسائل سے متعلق ہیں، ان میں تین ہزار الفاظ کی فرہنگ بھی شامل ہے، جو قابلِ ذکر

نام ان تختیوں میں پڑھے گئے ہیں وہ اس طرح پر ہیں

Mekeilu (Esau) Esaum (ابراہم) Abraamu Ishmail (David) Dauduem (Michael) (Israel) Ishrailu (Ishmael) ilum

فہرست میں پانچ شہروں کے نام ملتے ہیں۔

Phaliga, Sarugi, Tel-Turakhi, Nakhur, Haran,

یہ شہر حضرت ابراہیم کے رشتہ داروں کے نام سے جو کتاب مقدس میں مذکور ہیں مشابہ ہیں، وہ نام یہ ہیں۔

Peleg, Serug, Terah, Nahor, Haran,

پانچ اور شہر جن کا نام ان تختیوں میں آیا ہے وہ کم و بیش وہی ہیں جو بائبل میں ملتے ہیں یعنی

(۱) Sodom,
(۲) Gomorrah
(۳) Admah,
(۴) Zeboiim,
(۵) Bela,

یہ آخری شہر زوار بھی کہلاتا تھا،

ان تختیوں سے طوفانِ نوح کا پتا چلتا ہے جس میں دنیا تباہ و برباد ہو چکی تھی، یہ سارے کتبے ابھی پوری طرح پڑھے نہیں جا سکے ہیں، محققین کے زیر مطالعہ ہیں اور ان سے اہم نتائج برآمد ہونے کی قوی توقع ہے،

میں نے شام کے اس نو دریافت شہر کا ذکر کسی قدر تفصیل سے اس غرض سے کیا ہے کہ ہمارے محققین کو اس طرف متوجہ ہونا چاہئے، کیا عجب یہ شہر ان شہروں میں سے کوئی ہو جن کا ذکر قرآن نے کیا ہے، Sodom قوم لوط کا مسکن تھا اور اس کی تباہی کا ذکر بائبل میں بھی آیا ہے، اس سے مزید یہ بات پوری طرح ثابت ہے کہ جوں جوں علم و تحقیق کا قدم آگے بڑھے گا، قرآن کے حقائق سامنے آتے رہیں گے، علم کی کثرت قرآن کی تفہیم میں موید و مددگار ثابت ہوگی، قرآن کے امور کی توضیح مختلف علوم میں دسترس، مختلف زبانوں کے علم، مختلف اقوام اور تہذیبوں کے دقیق مطالعے، مختلف مذاہب کے باہمی مقابلے و مقایسے اور مختلف مذاہب کے علماء کے باہمی تعاون کے بغیر مشکل ہے،

اسلام کا دنیائے علم و تہذیب پر بڑا احسان ہے کہ اس کی وجہ سے متعدد علوم و فنون معرض وجود میں آئے جو دین رحمت سے قبل موجود نہ تھے، ان علوم میں علم حدیث، علم غریب الحدیث، اسماء الرجال، علم ناسخ و منسوخ، علم تلفیق حدیث، علم علل حدیث، علم تخریج حدیث، علوم تفسیر، علم قرأت و تجوید، علم فقہ وغیرہ وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، علم حدیث میں اقوال کے پرکھنے کے جو اصول مستنبط ہوتے ہیں، وہ انسانی فکر کی بلندی کو چھوتے ہیں، علم جرح و تعدیل علوم حدیث میں بڑا اہم سمجھا جاتا ہے، اس میں شہادت کے جو اصول منضبط ہوئے ہیں وہ اتنے بلند ہیں کہ ان کا تصور نہیں ہو سکتا، کسی قدیم قوم یا کسی تہذیب میں اقوال کے صحیح و

غیر صحیح کے اصول پوری طرح وضع نہیں ہوئے ہیں، دورِ جدید میں جو اصول وضع ہوئے ہیں ان میں ہم عصر شہادتوں کی بڑی اہمیت بتائی گئی ہے لیکن ان شہادتوں کی اصل حقیقت عدالت سے متعلقہ کارکنوں پر سب سے زیادہ واضح طور پر منکشف ہوتی ہے، کسی معاملے کا ایک گواہ حلفیہ بیان واقعہ کی صداقت پر پیش کرتا ہے تو دوسرا اسی وقت اسی کی تردید کرتا ہے لیکن اسلام نے شہادت کے جو معیار قائم کئے ہیں ان میں ہم عصر شہادت کو چند اور شرائط سے مشروط کیا ہے، ان کی وجہ سے حق اور باطل میں امتیاز آسان ہو جاتا ہے، علم اسماء الرجال کا وجود اسلام کا رہینِ منت ہے، آج سے ہزار سال پہلے کے سیکڑوں راویوں کے احوال و واقعات بڑے مستند ذرائع سے محفوظ کر دیئے گئے ہیں، یہ بذات خود نہایت وقیع کارنامہ اور علم تاریخ میں زبردست اضافہ ہے، پوری تاریخ انسانیت میں انگشت شمار شخصیات ملیں گی جن کی زندگی ایسے مستند ماخذ سے مرتب ہوئی ہے، اکثر اہم شخصیات کی حیثیت جب بلند تحقیقی کسوٹی پر کسی جاتی ہے تو وہ ظن و تخمین کی منزل سے آگے نہیں بڑھتی، شاید اسی حقیقت کی طرف اقبال نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے۔

گماں آباد ہستی میں یقیں مرد مسلماں کا	بیاباں کی شب تاریک میں قندیلِ رہبانی

چونکہ میری گفتگو کا موضوع وہ علوم و فنون ہیں جو قرآن کی نسبت سے رائج ہوئے، لہٰذا اس کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، علوم قرآن پر مسلمانوں نے خاصی توجہ کی ہے، ان میں ابن جوزی (م ۵۹۷) کی کتاب فنون الافنان فی عجائب القرآن، علامہ زرکشی (م ۷۹۴ھ) کی مشہور کتاب البرہان فی علوم القرآن، امام سیوطیؒ (م ۹۱۱) کی تصنیف کتاب الاتقان فی علوم القرآن عام طور پر معروف و متداول ہیں، دور حاضر کے فاضل ڈاکٹر صبحی الصالح اسی موضوع پر ایک کتاب بعنوان مباحث فی القرآن شائع کر چکے ہیں، اس کتاب کے مباحث

یہ آخری شہر زوار بھی کہلاتا تھا،

ان تختیوں سے طوفانِ نوح کا پتا چلتا ہے جس میں دنیا تباہ و برباد ہو چکی تھی، یہ سارے کتبے ابھی پوری طرح پڑھے نہیں جا سکے ہیں، محققین کے زیر مطالعہ ہیں اور ان سے اہم نتائج برآمد ہونے کی قوی توقع ہے،

میں نے شام کے اس نودریافت شہر کا ذکر کسی قدر تفصیل سے اس غرض سے کیا ہے کہ ہمارے محققین کو اس طرف متوجہ ہونا چاہئے، کیا عجب یہ شہر ان شہروں میں سے کوئی ہو جن کا ذکر قرآن نے کیا ہے، sodom قوم لوط کا مسکن تھا اور اس کی تباہی کا ذکر بائبل میں بھی آیا ہے، اس سے مزید یہ بات پوری طرح ثابت ہے کہ جوں جوں علم و تحقیق کا قدم آگے بڑھے گا، قرآن کے حقائق سامنے آتے رہیں گے، علم کی کثرت قرآن کی تفہیم میں موید و مددگار ثابت ہوگی، قرآن کے امور کی توضیح مختلف علوم میں دسترس، مختلف زبانوں کے علم، مختلف اقوام اور تہذیبوں کے دقیق مطالعے، مختلف مذاہب کے باہمی مقابلے و مقایسے اور مختلف مذاہب کے علماء کے باہمی تعاون کے بغیر مشکل ہے،

اسلام کا دنیائے علم و تہذیب پر بڑا احسان ہے کہ اس کی وجہ سے متعدد علوم و فنون معرض وجود میں آئے جو دین رحمت سے قبل موجود نہ تھے، ان علوم میں علم حدیث، علم غریب الحدیث، اسماء الرجال، علم ناسخ و منسوخ، علم تلفیق حدیث، علم علل حدیث، علم تخریج حدیث، علوم تفسیر، علم قرأت و تجوید، علم فقہ وغیرہ وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، علم حدیث میں اقوال کے پرکھنے کے جو اصول مستنبط ہوتے ہیں، وہ انسانی فکر کی بلندی کو چھوتے ہیں، علم جرح و تعدیل علوم حدیث میں بڑا اہم سمجھا جاتا ہے، اس میں شہادت کے جو اصول منضبط ہوئے ہیں وہ اتنے بلند ہیں کہ ان کا تصور نہیں ہو سکتا، کسی قدیم قوم یا کسی تہذیب میں اقوال کے صحیح و

غیر صحیح کے اصول پوری طرح وضع نہیں ہوئے ہیں، دور جدید میں جو اصول وضع ہوئے ہیں ان میں ہم عصر شہادتوں کی بڑی اہمیت بتائی گئی ہے لیکن ان شہادتوں کی اصل حقیقت عدالت سے متعلقہ کارکنوں پر سب سے زیادہ واضح طور پر منکشف ہوتی ہے، کسی معاملے کا ایک گواہ حلفیہ بیان واقعہ کی صداقت پر پیش کرتا ہے تو دوسرا اسی وقت اسی کی تردید کرتا ہے لیکن اسلام نے شہادت کے جو معیار قائم کئے ہیں ان میں ہم عصر شہادت کو چند اور شرائط سے مشروط کیا ہے، ان کی وجہ سے حق اور باطل میں امتیاز آسان ہو جاتا ہے، علم اسماء الرجال کا وجود اسلام کا رہین منت ہے، آج سے ہزار سال پہلے کے سیکڑوں راویوں کے احوال و واقعات بڑے مستند ذرایع سے محفوظ کر دیئے گئے ہیں، یہ بذات خود نہایت وقیع کارنامہ اور علم تاریخ میں زبردست اضافہ ہے، پوری تاریخ انسانیت میں انگشت شمار شخصیات ملیں گی جن کی زندگی ایسے مستند ماخذ سے مرتب ہوئی ہے، اکثر اہم شخصیات کی حیثیت جب بلند تحقیق کسوٹی پر کسی جاتی ہے تو وہ ظن و تخمین کی منزل سے آگے نہیں بڑھتی، شاید اسی حقیقت کی طرف اقبال نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے۔

گماں آباد ہستی میں یقیں مرد مسلماں کا
بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

چونکہ میری گفتگو کا موضوع وہ علوم و فنون ہیں جو قرآن کی نسبت سے رائج ہوئے، لہذا اس کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، علوم قرآن پر مسلمانوں نے خاصی توجہ کی ہے، ان میں ابن جوزی (م ۵۹۷) کی کتاب فنون الافنان فی عجائب القرآن، علامہ زرکشی (م ۷۹۴ھ) کی مشہور کتاب البرہان فی علوم القرآن، امام سیوطی (م ۹۱۱) کی تصنیف کتاب الاتقان فی علوم القرآن عام طور پر معروف و متداول ہیں، دور حاضر کے فاضل دکتور صبحی الصالح اسی موضوع پر ایک کتاب بعنوان مباحث فی القرآن شائع کر چکے ہیں، اس کتاب کے مباحث

یہ ہیں۔

باب اوّل: قرآن و وحی، باب دوم: تاریخ القرآن، باب سوم: علوم القرآن اس میں حسب ذیل مباحث شامل ہیں:

علم اسباب النزول، علم مکی و مدنی، علم القرآت، علم ناسخ و منسوخ، علم رسم القرآن، علم محکم و متشابہ۔

باب چہارم: تفسیر و اعجاز، یہ حسب ذیل چار فصلوں میں منقسم ہے، فصل اوّل: تفسیر اس کے ذیل میں اکثر تفاسیر اور مفسرین کا ذکر ہے، فصل دوم: القرآن یفسر بعضہ بعضا، فصل سوم: اعجاز القرآن، قرآن کے تشبیہات و استعارات، مجاز و کنایہ، فصل چہارم: اعجاز فی نظم القرآن۔

قرآنی علوم کی تفصیل جس طرح مباحث علوم القرآن اور اس قبیل کی دوسری کتابوں میں بیان ہوئی ہے وہ فنی اعتبار سے درست ہے لیکن عام طور پر یہ سارے مباحث علم تفسیر ہی کے ہیں، تفسیر کا ایک جامع علوم ہونا قرآن کا مرہون منت ہے، تفسیر کے لئے انگریزی کا لفظ Exegesis ہے جس کی اصل یونانی ہے اور جس کے لغوی معنی توضیح و تفسیر کے ہیں، یہ لفظ بائبل کی توضیح کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، چنانچہ لغت میں اس کے یہ معنی درج ہیں "Explanation, critical anas lysis or inter Pretation of a word, literary passage etc specially of Bible"

اور اس فن کا جو ماہر ہوتا ہے وہ Exegete کہلاتا ہے اور اس فن کا نام Exegetics ہے، اس تفصیل سے واضح ہے کہ بائبل کی تفسیر لفظ اور جملے کی توضیح و تشریح تک محدود تھی لیکن قرآن کی تفسیر کے حدود بہت وسیع ہیں، چنانچہ اس سے کئی علوم متعلق ہیں، اور ہر علم اپنی جگہ دقیق مطالعے

کا متقاضی ہے، مختصر یہ کہ علوم تفسیر قرآن کی دین ہے اور یہ سارے علوم تاریخ انسانیت کے اہم ابواب ہیں۔

قرآن کی نسبت سے علم تجوید کا ذکر نہایت ضروری ہے، اس علم کا مقصد اس لہجے کی حفاظت ہے جس لہجے اور انداز سے ابتداءً قرآن کی تنزیل ہوئی تھی، ظاہر ہے کہ اس طرح کا علم کسی زبان میں ممکن نہ تھا، حضور علیہ السلام کی محبت کا یہ نتیجہ تھا کہ مسلمان اس لہجے کو عملاً برقرار رکھنا چاہتے تھے جس میں قرآن پڑھا جاتا ہے، اس کی بنا پر اصول اور قواعد و ضوابط منضبط ہوئے، اور اس میں اتنے دقیق مسائل شامل ہوئے کہ رفتہ رفتہ یہ ایک وسیع اور اہم علم قرار پایا۔ یہ علم نظری اور عملی دونوں ہے، نظری لحاظ سے اس کی تحصیل آسان ہے، لیکن عملی اعتبار سے اس کا حصول نہایت کٹھن ہے، ہر ملک کے رہنے والوں کا الگ الگ لہجہ ہو جاتا ہے، ان کے مخارج حروف وغیرہ الگ ہوتے ہیں، غیر ملکی لہجے پر دسترس حاصل کرنے کے لئے ایک استاد کی رہنمائی میں قواعد و اصول کی رعایت کرتے ہوئے مدتوں مشق کرنی پڑتی ہے، لیکن اتنی دسترس بہم پہنچانے کے باوجود مثلاً ہندوستانی قاری کی آواز عربی یا مصری قاری کی آواز سے مختلف ہوتی ہے، دراصل مصوت، صامت، فشار، تکیہ وغیرہ میں جو دقیق فرق ملکوں ملکوں میں پایا جاتا ہے ان کا علمی احاطہ بڑی حد تک ناممکن ہے، اس دشواری کے باوجود [illegible] مسلمان اہل علم نے اپنی ساری زندگی اصل لہجے کی حفاظت اور اسی لہجے میں قرآن کریم کی ترتیل میں صرف کردی، دنیا کی کسی زبان میں ایسی کسی کتاب کا تصور نہیں ہو سکتا جس کے ابتدائی لہجۂ قرأت کو اس خوبی سے محفوظ کر لیا ہو کہ اس سے ایک جامع علم وجود میں آگیا، قرآن کی نسبت سے علم تجوید کی ایجاد علمی دنیا کا ایک بڑا وقیع کارنامہ ہے اور اسی لحاظ سے انسانیت پر قرآن اور اسلام کا بڑا احسان ہے، اگرچہ علم تجوید کی کارفرمائی صرف قرآن مجید تک محدود ہے، لیکن دورِ حاضر کے مشہور علم صوتیات پر اس علم کا خاصہ عمل دخل ہے، اگرچہ صوتیات کے ارتقا میں علم تجوید جو قرآن سے متفرع ہے زیادہ اثر انداز ہوا ہوگا، یہ بات کتنی اہم ہے کہ جب اہل اسلام

علم تجوید کو ایک بلند درجے تک پہنچا چکے تھے، اہل مغرب سامی علم کے مبادیات سے آگے نہیں بڑھ سکے تھے، تاریخ انسانی اس حقیقت کو کیونکر فراموش کر سکتی ہے کہ ایسا وقیع علم مسلمانوں کے توسط سے سینکڑوں سال پہلے وجود میں آچکا تھا،

قرآن کی نسبت سے ایک فنی تخصیص جو نہایت قابل توجہ ہے وہ اس کے متن کا طریقۂ تحفظ ہے، قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے اپنے ذمہ لے لی ہے، چنانچہ جس حیرت انگیز طریقے سے اس کا متن محفوظ کر دیا گیا ہے وہ دنیائے   کا ایک اعجوبہ ہے، عربی فارسی رسم خط اس لحاظ سے بڑا ناقص ہے کہ اس میں تحریف متن کی کافی گنجائش ہے، اس رسم خط کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نقطے اور شوشے کے ذریعے ایک حرف دوسرے حرف سے ممتاز ہوتا ہے، پھر بعض حروف کبھی جدا اور کبھی پیوستہ لکھے جاتے ہیں، پیوستگی کی حالت میں حرف اصل صورت سے مختلف ہو جاتا ہے، نقطوں اور شوشوں کا باقاعدہ التزام نہ ہونے کی بناء پر ایک حرف کا امتیاز دوسرے حرف سے اکثر باطل ہو جانا عام بات ہے، اس طرح سینکڑوں محرف الفاظ وجود میں آجاتے ہیں اور قاری اکثر دھوکے کا شکار ہو جاتا ہے، بنی آدم کو بنی آدم پڑھنے والے دیکھے گئے ہیں، کبھی کبھی ایسے لوگ مل گئے ہیں جو محجوب کو محبوب اور رحجان کو رجحان پڑھتے ہیں، ان خصائص کا لازمی نتیجہ قدیم متن کی تخریب و تحریف کی شکل میں برآمد ہوتا ہے، اور یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ کسی کتاب کے دو قلمی نسخے یکساں نہیں ہو سکتے اس لئے کہ کاتب انسان اور انسانی جذبات سے مرکب ہے، جذبات و احساسات جہاں عالم میں رنگا رنگی کے موجب ہیں، وہاں ان کی کارفرمائی سے ایک خطی نسخہ دوسرے نسخے سے کسی نہ کسی لحاظ سے الگ ہو جاتا ہے، مشین کا عمل اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے، یعنی ایک مشین پر چھپے ہوئے سارے فرمے یکساں ہونگے، ان میں کسی قسم کا بنیادی فرق نہ ہوگا، ایسا کبھی نہ ہوگا کہ ایک فرمے میں تو عقل ہے تو دوسرے میں اس کی جگہ فکر، لیکن قلمی نسخے کی یہ ناقابل انکار خصوصیت ہے کہ دو نسخے

نسخے سے خواہ وہ پہلے ہی نسخے سے مرتب ہوا ہو، کسی نہ کسی درجے میں متفاوت ہوگا، رہا اختلافات کی حد بندی تو عام نسخوں میں ہزاروں سے تجاوز کرنا عام بات ہے، اس سے دوسرا صریحی نتیجہ یہ نکلا کہ جس کتاب کے جتنے زیادہ نسخے ملتے ہیں وہ کتاب اپنی اصل سے اتنی ہی زیادہ دور ہو جاتی ہے، دنیا کی مقبول ترین کتاب میں اصل مصنف کا حصہ بالکل اس طرح گھٹ جاتا ہے جیسا ہومیو پیتھک کی تیز دواؤں میں مادی اجزاء، اگر یہ تمام نسخے مصنف کے روبرو پیش ہوں تو وہ اپنے خاص نسخے کی تلاش میں ناکام رہے گا، سعدی کی گلستاں فارسی کی مقبول ترین کتابوں میں ہے، اگر اس کے تمام نسخوں کے تمام اختلاف کو اکٹھا کر لیا جائے تو وہ لاکھوں کے حدود میں ہوں گے، گویا ایک لاکھ نسخوں میں صرف ایک نسخہ اصل ہوگا اور ننانوے ہزار نو سو ننانوے نسخے مختلف ہوں گے، اگر سعدی زندہ ہوں اور ان کے سامنے یہ دانشگاہی معاً پیش کیا جائے تو وہ حیرت زدہ رہ جائیں اور دوسری گلستاں تالیف کرنا منظور کر لیں۔

ان امور کی روشنی میں قرآن پر ذرا غور کریں، قرآن کریم وہ کتاب ہے جو سب سے زیادہ پڑھی گئی ہے اور جس کے سب سے زیادہ نسخے ملتے ہیں، اکثر علما کے نزدیک قرآن لفظ القراۃ سے نکلا ہے جس کے معنی پڑھنے کے ہیں، اس لحاظ سے قرآن کا یہ نام اعجاز ہے، اس لئے کہ قرآن کا زیادہ پڑھا جانا خود اس لفظ کے وجود کا جزء ہے، قرآن کے سب سے زیادہ پڑھے جانے کی دلیل یہ ہے کہ یہ کتاب حفظ کی جاتی ہے اور ابتداء سے اس وقت تک حفاظ کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہو چکی ہوگی، ہر حافظ اپنی حیات میں قرآن کو ہزاروں سے زیادہ بار پڑھ چکا ہوگا، پھر قرأت میں تفسیر قرآن اور حدیث کے درس میں قرآن کی بار بار تکرار ہوتی ہے، قرآن کا پڑھنا عبادت ہے، ابتداء اسلام سے اس وقت تک مسلمانوں کی تعداد کئی ارب سے متجاوز ہو چکی ہوگی، ان میں سے کچھ فیصد تو قرآن پڑھتے ہی ہونگے، اس سے آپ قرآن کی کثرت تلاوت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

علاوہ بریں پنج وقتی نمازوں، رمضان کی تراویح اور قرآن خوانی کی مجالس میں قرآن کریم کا بار بار پڑھا جانا ایسے امور ہیں جن سے بآسانی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ دنیا کی کوئی کتاب اس خصوصیت کی حامل نہیں، یہ رہی پڑھنے کی صورت، اب ذرا اس کے لکھے جانے کی صورت کا قیاس کریں، دنیا میں پھیلے ہزاروں کتاب خانے اور میوزیم میں شاید کم ایسے ہوں گے جو قرآن کے قلمی نسخوں سے عاری ہوں، میرے علم کے مطابق ایران کے شہر مشہد کے کتاب خانہ آستانِ قدس میں ساڑھے[1] چار ہزار سے زیادہ قلمی نسخے اب بھی موجود ہیں، رامپور کے کتاب خانے اور مصر کے دار الکتب میں سے ہر ایک میں دو سو سے زیادہ قلمی نسخے شامل ہیں، اس سے ایک عمومی اندازہ کے مطابق اس وقت شاید ایک لاکھ نسخے اس عظیم کتاب کے موجود ہوں، اور اتنی بڑی تعداد دنیا کی کسی زبان کی کسی ایک کتاب کا کیا ذکر متعدد کتابوں کی مل کر نہ ہوگی، مقدس کتب کا تو ذکر ہی نہیں، مجھے ذاتی طور پر معلوم نہیں کہ ہندو مذہب کی مقدس کتاب وید کے کتنے نسخے ملتے ہیں لیکن اتنا یقینی ہے کہ اس کے خطی نسخے انگشت شمار ہوں گے، اور توریت و انجیل کے ترجمے متداول ہیں، اصل نسخے جو موجود ہوں گے ان کی تعداد مختصر ہی ہوگی، زرتشتیوں کی مقدس کتاب اوستا ہے۔ اس کا اصل نسخہ سکندر کے فتح اصطخر کے موقع پر نذر آتش ہوگیا تھا، اس کے بعد کسی قلمی نسخے کا پتہ نہ تھا، بعد میں یادداشت اور حافظے سے اوستا کے اجزاء مختلف ادوار میں مرتب ہوئے جن میں زبان کی یکسانی بھی نہیں۔ اس کا آخری حصہ جو خردہ اوستا کہلاتا ہے وہ ساسانی دور میں زرتشت سے تقریباً ہزار سال بعد مرتب ہوا، خردہ اوستا اور گاتھا جو اوستا کا قدیم ترین حصہ ہے، ان دونوں کی زبانوں میں بہت کافی فرق ہے، بہرحال، اب نہ اصل اوستا کا پتہ ہے اور نہ اس کے اصلی رسم خط کا،

---

[1] تبریز میں ربع رشیدی ایک محلہ تھا جس میں رشید الدین فضل اللہ نے ایک کتاب خانہ ترتیب دیا تھا جس میں قرآن کے ایک ہزار نسخے تھے۔

موجودہ اوستا ایک ایسے خط میں تحریر کیا گیا جو ساسانی دور کے پہلوی خط سے مقتبس ہے،

اس تفصیل سے واضح ہے کہ قرآن کریم دنیا میں سب سے زیادہ لکھی گئی کتاب ہے، اور یہ بھی قابل ذکر ہے کہ دنیا کی کسی کتاب پر اتنی فنی مہارت صرف نہیں ہوئی جتنی اس کے قلمی نسخوں کی تیاری میں صرف ہوئی ہے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ اور جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے ہمارے رسم خط کی بعض خصوصیات کی بنا پر نسخے کی کثرت متن کی صحت کی ضمانت کے برخلاف ہے، کسی کتاب کے جتنے زیادہ نسخے ہوں گے اتنی ہی وہ اپنی اصل سے دور ہوگی تو قرآن کے اتنی کثرت سے لکھے جانے کا صریحی نتیجہ اس کے متن میں غیر معمولی تحریف و تصرف کی شکل میں ظاہر ہونا تھا۔ مگر ایسا نہیں ہوا، اور حیرانعقول بات یہ کہ قرآن کے لاکھوں نسخوں کے درمیان ایک نقطے، شوشے یا اعراب کا فرق نہیں ملتا، قرآن کے قدیم ترین نسخے سے ایک جدید نسخے کا مقابلہ کرنے پر جو حیرت انگیز یکسانی ملتی ہے وہ دنیا کے علم کا بہت زبردست اعجوبہ ہے، اس سے بڑھ کر بات کیا ہوسکتی ہے کہ قرآن کے سارے نسخے نظر انداز کر دیے جائیں اور ایک حافظ قرآن کی مدد سے مثلاً شام میں ایک نسخہ تیار کرا لیا جائے اور دوسری طرف مشرق میں ملیشیا میں دوسرے حافظ کے ذریعہ ایک دوسرا نسخہ مرتب کرا لیا جائے اور پھر خواہ ان دونوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ کر لیا جائے یا ان میں سے ہر ایک کا کسی اور قدیم یا جدید نسخے سے مقابلہ کیا جائے تو ان میں کسی ایک مقام پر سرمو فرق نہ ملے گا، یہ قرآن کا جیتا جاگتا معجزہ ہے، تاریخ انسانی میں ایسے محقق متن کی کوئی مثال کہاں ملے گی، شاید ایک سطر تحریر بھی موجود نہ ملے گی جو ایسی محقق اور معتبر ہو جیسی کہ قرآن کی تحریر، حفظ قرآن کی روایت اوائل دورۂ اسلام سے قائم چلی جارہی ہے اور جب تک دنیا قائم ہے انشاء اللہ باقی رہے گی، ایک حافظ اپنے سینے میں محفوظ امانت دوسرے کے سینے میں بغیر کسی تغیر و تبدیل کے منتقل کرتا رہتا ہے اور قیامت تک کرتا رہے گا۔ ایسی حفظ و امانت کی مثال دنیا کی تہذیب میں کہاں ملے گی۔ حفاظ حضرات جس ستائش کے مستحق ہیں وہ کم لوگوں کا حصہ ہوگا، قرآن کے ان سب سے بڑے محافظوں و پاسبانوں پر اللہ اپنی رحمتوں کی بارش کرے، آمین (باقی)

کشمیر میں اسلام کی اشاعت

از

ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری شعبۂ عربی امر سنگھ کالج (کشمیر)

(۳)

صوفیائے کرام

کشمیر میں اشاعتِ اسلام کا سہرا حضرات صوفیائے کرام کے سر ہے، انھوں نے یہاں وہ کام کیا جو حملہ آوروں سے نہ ہو سکا، ان ہی بزرگوں نے یہاں مستقل اقامت کرنے کی ہمت کی، اور پھر اسی غریب الوطنی کی حالت میں یہاں سیاسی اور مذہبی انقلاب لائے، ان کی زندگی کی غرض وغایت صرف تبلیغ واشاعتِ دین تھی، اس مقصد کو بروئے کار لانے میں وہ جان ومال کی بھی پروا نہ کرتے تھے، بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی "حالات کی نامساعدت اور ماحول کی برہمی قدم قدم پر دامن پکڑ کر کھینچتی تھی، لیکن شوق کی بے پایانی پکار پکار کر کہتی تھی،

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزارِ ہستی میں ‌ ‌ ‌ ‌ تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے[1]

برصغیر میں عموماً اور کشمیر میں خصوصاً ان ہی بزرگوں نے اسلام پھیلایا، علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں "کشمیر میں حملہ آوروں نے نہیں بلکہ مسلمان عالموں اور درویشوں

[1] تاریخِ مشائخِ چشت: پروفیسر نظامی، ندوۃ المصنفین دہلی: ص ۱۴۲ -

کی تاثیروں نے مسلمانوں کے دلوں کو فتح کیا[1]"

افسوس ہے کہ ناسازگار ماحول اور ناموافق زبان وتہذیب کی وجہ سے ہماری تاریخوں میں ان بزرگوں کے نام محفوظ نہیں رہے ہیں، جو قدیم زمانوں میں کشمیر تشریف لائے تھے، تاہم اب یہ یقین کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ ریشیان کشمیر وہ غیر ملکی بزرگانِ دین تھے، جو سید شرف الدین (بلبل شاہ) سے سالہا سال قبل کشمیر آئے تھے، اور ان میں بہت سے مقامی لوگ بھی مسلمان بن کر شامل ہوئے تھے، انھوں نے مل کر یہاں خاموش طریقے پر اسلام پھیلایا، تیرھویں صدی کے اختتام پر مار کو پولو کشمیر آیا تھا، اس کے بیان کے مطابق یہاں اس زمانے میں مسلمان موجود تھے، وہ لکھتا ہے کہ یہاں کے لوگ جانوروں کو نہیں مارتے، البتہ اگر وہ کبھی گوشت کھانا چاہتے ہیں تو مسلمانوں سے ذبح کراتے ہیں جو ان ہی میں رہتے بستے ہیں،

سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشت

سید اشرف جہانگیر سمنانی نے بیان کیا ہے کہ حضرت شیخ جلال الدین (متوفی ۷۸۵ھ) نے جتنے سفر کئے ہیں اتنے کسی بزرگ نے نہیں کئے ہیں[2]، مگر قدیم تاریخوں اور مستند تذکروں میں ان کے ورودِ کشمیر کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا ہے، البتہ صدیاں گذرنے کے بعد ان کے بعض اخلاف کشمیر آئے، اور یہیں مستقل اقامت اختیار کی[3]، مگر تعجب یہ ہے کہ کشمیر کے چند مورخین حضرت شیخ کی کشمیر تشریف آوری کے قائل نظر آتے ہیں، اور انھیں نہایت قدر

[1] عرب وہند کے تعلقات ص ۱۰۴

[2] لطائفِ اشرفی جلد ۲ بحوالہ بزمِ صوفیہ: جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن: ص ۲۰۴

[3] تذکرہ حضرت سید جلال الدین: جناب سخاوت مرزا صاحب حیدرآباد ۱۹۶۲ء ص ۲۵۲، ۲۵۳ -

عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں، مغل دور کے چند نامور کشمیری علماء نے بھی حضرت شیخ بخاریؒ کا والہانہ انداز میں ذکر کیا ہے[1]، البتہ وہ ان کے کشمیر آنے کا کوئی ذکر نہیں کرتے، پروفیسر سری کنٹھ کول لکھتے ہیں کہ میر سید محمد ہمدانی (فرزند میر سید علی ہمدانیؒ) اس وقت کشمیر آچکے تھے، جب سادات کی ایک نئی جماعت سید جلال الدین بخاری کی پیشوائی میں کشمیر وارد ہوئی[2]، مگر یہ اسی نام کے دوسرے بزرگ ہیں، ان سے حضرت مخدوم جہانیاں مراد لینا صحیح نہیں ہے، اگر ان سے حضرت مخدوم مراد لیا جائے تو وہ از روئے تاریخ غلط ہوگا، کیونکہ حضرت میر ہمدانیؒ کے بارے میں تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ وہ ۷۹۶ھ میں کشمیر آئے، جبکہ اس سے نو سال قبل ۷۸۵ھ میں مخدوم شیخ بخاری کا انتقال ہو چکا تھا۔

---

[1] حضرت علامہ داؤد خاکی کشمیری فرماتے ہیں:-

آں بخاری نسبت سید جلال الدین لقب	قطب عالم بود مخدومیش اشہر شدست
کے بیاں کردن مقاماتش مجالِ من بود	خود زبان لال و عبارت زیں بیاں اقصر شدست
چشم فیض از لطفِ او دارم کہ فیضِ عامِ او	تا دم محشر پئے اتباع مستنشر شدست
اوست یک صاحبقراں یک قرن اندر ملک	زیں مشائخ ہر یکے ارشاد را محور شدست

ورد المریدین: مطبوعہ دہلی ص ۱۶۹۱۴

ایک اور کشمیری عالم اور محدث ان کا تذکرہ ان اشعار سے شروع کرتے ہیں:-

آنکہ از چشم نبوت زبدہ چوں انسانِ عین	در نظر ابرار نگاہ او فزودہ زیب و زین
از بواطن صیقلِ فیضش زدودہ زنگ و رین	قطبِ عالم حضرت سید جلال الدین حسین

اسرار الابرار قلمی شیخ داؤد مشکوتی

[2] تمہید راج ترنگنی ص ۹۵

حضرت سید محمد گیسو دراز

حضرت گیسو دراز نے اگرچہ زیادہ سیاحت نہیں کی ہے تاہم اقبال الدین احمد کے مطابق شیخ گیسو دراز ملتان سے اٹک تک کے کنارے ایبٹ آباد پہونچے، پھر یہاں سے سیدھے سرینگر کشمیر وارد ہوئے تو حضرت سید علی ہمدانی آپ کا استقبال کرنے کے لئے نکلے، اور اپنی خانقاہ میں پہونچایا، یہاں کے فقراء سے ملاقات کی، پھر شیخ محمد گیسو دراز نے جامع مسجد کے دروازہ پر کھڑے ہو کر بہت دیر تک دعا کی، اور فاتحہ پڑھنے کے بعد کہا "یہاں اکثر بزرگ موجود ہیں"، اور دریائے جہلم سے مخاطب ہو کر کہا: "اے دریا کے اندر رہنے والے بزرگ اللہ کی رحمتیں آپ پر ہوں"، اس کے بعد شیخ محمد گیسو دراز سیالکوٹ کے ارادہ سے نکلے۔[1]

شیخ علاء الدین بن شیخ بدر الدین سلیمان بن شیخ فرید الدین گنج شکر

شیخ علاء الدین صرف سولہ سال کی عمر میں اپنے والد شیخ بدر الدین سلیمان کے سجادۂ رشد و ہدایت پر بیٹھے اور ۶۶۴ھ سے ۷۲۴ھ چالیس سال تک اپنے نانا شیخ فرید الدین گنج شکر (م ۵ محرم ۶۲۴ھ) کا فیض عام کیا، ان کے مریدوں میں کشمیر کے گرد و نواح کے لوگ بھی تھے، جنھیں ان کے ساتھ اتنی وابستگی تھی کہ اپنی جگہوں پر ان کی یادگار میں "روضے" تعمیر کئے، جن سے وہ تبرک حاصل کرتے تھے، سید محمد بن مبارک کرمانی (امیر خورد) لکھتے ہیں:

صیتِ عظمت و کرامتِ او ہم در	ان کی زندگی ہی میں ان کی عظمت و
حیاتِ عزیز او میانِ عالم منتشر شد	کرامت کی شہرت دنیا میں پھیل گئی،
و اسمِ مبارکِ و میانِ اسامئ اولیا	اور اولیاء اللہ کے ہاں ان کا نام
مذکور و مشہور گشت، چنانکہ در	مشہور ہوا، چنانچہ اجودھن دیپال پور
دیار اجودھن و دیپال پور و جبال کہ	اور کشمیر کی جانب ایک پہاڑ کے

---

[1] تذکرۂ خواجہ گیسو دراز: اقبال الدین احمد: ص ۵۴، اقبال پبلشرز جیدر آباد کالونی کراچی۔

سمت کشمیر است خلق آں دیار از اعتقاد
محبت و اعتقاد مقامہا ساختہ اند و قبر بلبل
د بنام روضۂ متبرکہ او تیمن و تبرک می گیرند
و در آں موضع صدقات و ختمات می کنند[1]

لوگوں نے زبردست محبت اور اعتقاد
کے زیر اثر ان کے نام پر مقامات مقدسہ
تعمیر کیے، جن سے وہ تبرک حاصل کرتے
ہیں اس کے علاوہ ان جگہوں پر ختمات
پڑھتے اور صدقات دیتے ہیں۔

سید شرف الدین عبد الرحمٰن بلبل شاہ وہ کشمیر میں اپنے اصلی نام سے زیادہ عرف ہی سے مشہور و معروف ہیں، کشمیر کی سیاست میں سب سے پہلے ان ہی کی مساعیٔ جمیلہ سے اسلام داخل ہوا، اسی وجہ سے ان کا نام ہماری تاریخوں میں محفوظ رہا ہے، مگر بدقسمتی سے ان کے ورودِ کشمیر اور خدمتِ اسلام کو کرامات کے چکر میں الجھا دیا گیا ہے، جس سے بہت سے تاریخی واقعات پر تہ بہ تہ گرد چڑھ گئی ہے، یہاں تک کہ بعض حضرات ان کو کشمیر وارد ہونے والا پہلا مسلمان قرار دیتے ہیں، جو از روئے تاریخ صحیح نہیں ہے۔

وہ حضرت شاہ نعمت اللہ فارسی کے مرید تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ جب کشمیر کا حکمراں رنچن تخت نشین ہوا تو اس کو اپنے موروثی مذہب اور کشمیر میں دوسرے مذاہب سے بے اطمینانی ہوئی، وہ ایسے مذہب کی تلاش میں لگا جو اسے روحانی سکون اور قلبی اطمینان دے سکتا تھا، اس مقصد کے لئے اس نے کشمیر میں مختلف مذاہب کے نمایندوں کو بلایا، اور ان کے ساتھ بحث کی، وہ کسی بھی مذہب سے مطمئن نہ ہوا، اس نے فیصلہ کیا کہ صبح سویرے جس شخص پر بھی اس کی پہلی نظر پڑے تو وہ اسی کا مذہب قبول کر لیگا، صبح سویرے اس کی نظر

[1] سیر الاولیاء مطبوعہ دہلی ۱۳۰۲ھ: ص ۱۹۳۔

سید شرف الدین پر پڑی جو دریائے جہلم کے کنارے نماز ادا کرتے رہے تھے، رنچن نے ان کو بلایا، اور ان کے مذہب اور نماز کے بارے میں پوچھا، اسی وقت مسلمان ہوا، اور صدر الدین اسلامی نام اختیار کیا، حضرت شیخ نے جہلم کے کنارے ایک خانقاہ تعمیر کی، اور اس کے ساتھ ایک لنگر ملحق کیا، بعد میں یہ جگہ بلبل لنگر یا بلبل لنکر کے نام سے مشہور ہوئی، حضرت شیخ نے یہیں انتقال کیا، اور یہیں مدفون بھی ہیں[1]، اس طرح سلطان صدر الدین رنچن کشمیر کا پہلا مسلمان ہوا، اور سیاسی اعتبار سے اسی وقت ہندو دورِ حکومت کا اختتام عمل میں آیا،

سید شرف الدین کے بعد کشمیر میں اشاعتِ اسلام جیسے اہم کام میں شیخ شرف الدین نے غیر معمولی خدمت انجام دی، مگر شاید زیادہ وقت نہ ملنے کی وجہ سے وہ کوئی انقلاب نہ لاسکے چنانچہ حضرت شیخ شرف الدین کے انتقال کے فوراً بعد کشمیر میں اسلام کے نو زائیدہ نقوش و اثرات مٹنے شروع ہوئے، اور یہاں جو مسلمان موجود تھے وہ دین سے غافل محض ہو کر صرف نام کے مسلمان رہے، زندگی کے آداب و رسوم میں وہ ہندو مذہب کی تقلید کرنے لگے، یہاں تک کہ بہت جلد بنیادی عبادات و عقائد سے بھی بے خبر ہوئی، مگر قدرت کا منشا یہی تھا کہ کشمیر میں غیر اسلامی تہذیب و معاشرت اپنی آخری گردش مکمل کرلے اور اس کی جگہ اسلام ہی پھیلے، اور اسے استحکام ملے، اس لئے کچھ ہی مدت کے بعد ایران و عراق کے شیوخ اور اکابر کی جماعت کشمیر وارد ہوئی، انھوں نے کشمیر کے چپے چپے پر مساجد، لنگر، خانقاہیں اور تربیت گاہیں قائم کیں، جس کے نتیجے میں مختصر مدت کے بعد ہی یہاں عظیم مذہبی، سیاسی اور تہذیبی انقلاب رونما ہوا، اس جماعت کی راہنمائی اور سربراہی امیر سید علی بن شہاب الہمدانی نے کی، شیخ ہمدانی نے کشمیر میں جو گرانقدر تبلیغی اور روحانی خدمات انجام دیئے اس کا اندازہ اسی سے لگایا

[1] یہ معلومات ہم نے تاریخ حسن ج ۲ ۲۳ تاریخ اعظمی اور اسرار الابرار سے لئے ہیں۔

جا سکتا ہے کہ وہ کشمیر میں بانیِ اسلام کے لقب سے مشہور ہیں، بلکہ ایک یورپی مقالہ نگار نے اسی مناسبت سے انھیں پیغمبرِ کشمیر کے نام سے یاد کیا ہے۔

اسلامی دنیا میر سید علی ہمدانی کے عہد میں شیخ ہمدانی کا زمانہ عالم اسلام کے لئے امید و اضطراب کا زمانہ تھا، ایک طرف تاتاریوں کے حملوں سے ہر طرف کھنڈرات دکھائی دیتے تھے، اور دوسری طرف انہی کھنڈرات سے اذانیں بھی سنائی دے رہی تھیں،

شیخ ہمدانی نے ۱۲ رجب ۷۱۴ھ مطابق ۲۱ اکتوبر ۱۳۱۴ء میں ولادت پائی اور ان کا انتقال ۷۸۶ھ مطابق ۱۳۸۴ء میں ہوا، اس طرح ان کا زمانہ لگ بھگ آٹھویں صدی ہجری یا چودھویں صدی عیسوی پر پھیلا ہوا ہے، شیخ ہمدانی کی ولادت سے ایک صدی قبل چنگیز خاں اور اس کی درندہ صفت قوم کی خون آشام تلوار اور بے لگام بربریت سے اسلامی تہذیب و ثقافت کے گہوارے **تودۂ خاک** ہو گئے تھے، میر سید علی ہمدانیؒ کا وطن بھی اسی آگ کی لپیٹ میں تھا،

مگر ابھی کچھ دہائیاں بھی نہ گزرنے پائی تھیں کہ کچھ ایسے حالات رونما ہوئے کہ خاک اور راکھ کے ان ڈھیروں میں اسلام کی چنگاریاں سلگتی نظر آئیں اور ٹوٹے ہوئے در و دیوار اور پھیلے ہوئے کھنڈرات میں نعرہائے تکبیر سنائی دئے،

میر سید علی ہمدانی کے زمانے میں یہی منگول جو عام مذاہب کو بالعموم اور اسلام اور مسلمانوں کو بالخصوص فنا کے گھاٹ اتارنے کے لئے میدان میں آئے تھے، اب جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے اور پورے عزم و شوق کے ساتھ اسلام کی احیائے نو میں مصروف ہوئے، سب سے پہلے برکہ خان ([illegible] حکومت ۱۲۵۷ء تا [illegible]ء) جو چنگیز کے بیٹے جوجی خاں کی اولاد میں سے تھا، دائرۂ اسلام میں داخل ہوا، اس نے مصر کے بادشاہ رکن الدین سے معاہدت کی، ہلاکو خان نے

بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی، مگر اس کا بیٹا تکودار خاں نہ صرف خود مسلمان ہوا بلکہ دوسرے تاتاریوں کو بھی دائرۂ اسلام میں لانے میں کوشاں رہا، ۱۲۸۴ء میں تکودار ایک سازش کا شکار ہو کر قتل کیا گیا، یہ سازش ارغون خاں کی تھی، جو تکودار کو قتل کرنے کے بعد خود مالک تاج و تخت بنا، اس کے زمانے میں مسلمانوں کو کچھ وقت کے لئے دوبارہ سخت آزمائشوں کا شکار ہونا پڑا، اگرچہ ۱۲۹۵ء میں غازان خاں تخت نشین ہوا، اس نے نہ صرف خود اسلام قبول کیا، بلکہ اسلام کو ایران کا شاہی مذہب بھی قرار دیا غازان خاں نے ۱۳۰۴ء تک ایران میں اسلام کی اشاعت کی ہر ممکن کوشش کی، اس کے بعد اس کا بھائی سلطان محمد خدابندہ تخت نشین ہوا، اس کا دینی رجحان ابتدا میں عیسائیت کی طرف تھا، کیونکہ اس کی ماں عیسائی تھی، مگر وہ اپنی ماں کے اثر سے آزاد ہو کر اپنی مسلمان بیوی کی ہدایت و نصیحت پر مسلمان ہوا، اس کے مسلمان ہونے سے بہت سے [illegible]وں کے دل بھی بدل گئے اور انھوں نے بھی اسلام قبول کیا، اسی زمانے میں جناب میر سید علی ہمدانی کی ولادت ہوئی، مغلوں کی ایک شاخ بلاد متوسط پر قابض تھی، اس میں جو سب سے پہلا خان مسلمان ہوا وہ براق خان تھا، اس نے اپنا نام غیاث الدین رکھا، اگرچہ اس کے بعد مغلوں نے پھر اپنا قدیم مذہب اختیار کیا، مگر کچھ دنوں کے بعد اس خاندان کے ایک اور بادشاہ ترمشیرین خان (۱۳۲۲ء تا ۱۳۳۰ء) نے اسلام قبول کیا، اس کے اثر سے تاتاری کثیر تعداد میں مسلمان ہوئے، اس وقت میر سید علی ہمدانی کی عمر لگ بھگ پندرہ سال کی تھی، اسی زمانے میں کاشغر کا مشہور اور صاحب سطوت حکمراں امیر تیمور شیخ جمال الدین کی راہنمائی سے مسلمان ہوا، اگرچہ امیر تیمور بڑا سفاک تاتاری تھا، مگر اس نے اسلام کی نشر و اشاعت اور اسلامی رسوم و قواعد کے استحکام کی طرف بھی توجہ کی،[1]

اسی عہد میں اسلام اور اہل اسلام کے لئے ایک اور خوش آیند چیز یہ تھی کہ عثمانی ترک یوری

[1] اس کے لئے ظفر نامہ یزدی ملاحظہ کی جا سکتی ہے،

طاقت وسطوت کے ساتھ ابھرنے لگے اور وہ اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لئے پوری ہمت کے ساتھ میدان میں آئے، شیخ ہمدانی کی زندگی کے آخری دور میں سلطان مراد اول کو دھوکے سے قتل کیا گیا، اور بایزید اول نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی، اپنا قدم جمانے اور ملک میں امن واطمینان قائم کرنے کے بعد اس نے فرنگیوں کی طرف رخ کیا، جو مسلمانوں کو ذلیل ورسوا کرنے اور اقتدار سے ہر طرف محروم رکھنے کے لئے کوشاں تھے، بایزید نے ~~۱۳۹۳ھ~~ (یعنی شیخ ہمدانی کے انتقال کے صرف پانچ سال بعد) بلغاریہ اور سربیا کو اپنے قبضے میں لے لیا، پھر ~~۱۳۹۶ء~~ میں فرانس، انگلستان، اسکاٹ لینڈ، لمبارڈی، جرمنی اور آسٹریا کے ۱۲ لاکھ اشخاص پر مشتمل فرنگی فوج کو شکست فاش دی، بدقسمتی سے بایزید اور امیر تیمور میں جنگ چھڑ گئی، دونوں قوت و قاہری میں ہم پلہ تھے، اس لئے دونوں طرف سے گھمسان کی لڑائی ہوئی جس میں بالآخر امیر تیمور ہی کامیاب رہا، اس نے بایزید کو انگورہ (موجودہ انقرہ) میں شکست دی اور اسے گرفتار کیا، یہ دونوں اس عہد میں ایسے دبدبے کے حکمراں تھے کہ اگر وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے تو یہ ضرور مشرق ومغرب اور جنوب وشمال کو اسلامی جھنڈے کے نیچے لاسکتے تھے،

جس زمانے میں ایران، عراق، ترکستان اور شام وغیرہ ممالک تاتاریوں کی قہرمانیوں کے نذر ہوئے، اس زمانے میں دو ایک اسلامی سلطنتیں محفوظ رہیں، ہماری مراد وسیع وعریض ہندوستانی مملکت اور مصر سے ہے، ہندوستان ان عرب اور وسط ایشیائی مہاجر علما اور صوفیہ کا ملجا وماویٰ بن گیا، جو مغلوں کے جبر وقہر سے بچ کر ہندوستان وارد ہونے میں کامیاب ہوئے تھے، انھوں نے ہندوستان میں مستقل طور پر اقامت اختیار کی اور پھر بہت جلد اپنے علم وفضل، فن وہنر اور زہد وتقویٰ سے اس ملک کو اسلام کی فکری، روحانی، تہذیبی اور علمی تحریکات کا مرکز بنایا، اسی طرح جب تاتاری خوارزم، ایشیائے کوچک، ہمدان، سمرقند، بخارا، رے، نخان، مرد،

اور بغداد کو زیر وزبر کر کے مصر کی طرف بڑھنے لگے تھے تو مصر کے حکمراں سیف الدین قطر کے ہاتھوں ان کو شکستِ فاش ہوئی، اس طرح یہ ملک بھی مصئون ومحفوظ رہا،

اسی زمانے میں اسلامی دنیا میں بالعموم اور مصر وشام میں بالخصوص نامور مجدّدِ اسلام اور نادرۂ روزگار فاضل شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ حرانیؒ کا غلغلۂ علم اور نعرۂ اصلاح وتجدیدِ دین بلند ہوا، ان کے انتقال کے وقت میر سید علی ہمدانی کی عمر چودہ سال کی تھی، ابن تیمیہ نے اس زمانے میں سیاست، علم، دین اور زندگی کے تمام گوشوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا، اس کے لئے سخت مزاحمتوں کا مقابلہ کیا، قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں لیکن انھوں نے مسلمانوں میں اپنی تصنیفات کے ذریعہ سے ان کے علمی جمود پر کاری ضرب لگادی، اس کے علاوہ اپنے باکمال شاگردوں کی ایک جماعت بھی تیار کی، جن میں علامہ ابن قیم، حافظ ابن کثیر، حافظ ابن رجب وغیرہ جیسے اکابر امت شامل ہیں، اور یہ سب شیخ ہمدانی کے معاصر تھے۔

اس عہد میں مسلمان سلاطین کے حکمرانوں میں دین کا گہرا جذبہ پایا جاتا تھا، اس وقت کے ہندوستانی حکمراں زہد وتقویٰ میں کسی بڑے سے بڑے عابد شب زندہ دار سے کم نہیں تھے، اسی طرح تاتاری نومسلم حکمراں بھی بغیر کسی جبر واکراہ یا مصلحت وسیاست کے اسلام کے شیدائی بن گئے تھے، اور ان میں اسلام کو جاننے اور اس کے احکام پر عمل کرنے کا جذبہ پیدا ہورہا تھا، حضرت میر سید علی ہمدانیؒ اپنی فاضلانہ تصنیف ذخیرۃ الملوک کے پیشِ لفظ میں اسی تاریخی حقیقت کی غمازی کرتے ہیں۔

یقول العبد الفقیر علی بن	فقیر بندہ علی بن شہاب ہمدانی
شہاب الہمدانی کہ مدتی بود کہ	عرض کرتا ہے کہ کافی وقت سے

جمعی از ملوک و حکام اہلِ اسلام	کہ مسلمان سلاطین، حکام، امراء
و اماجد و اشراف نوعِ انام	اور اکابر امت کی ایک جماعت دینی
کہ در استصلاحِ امورِ دین اہتمام	امور کی اصلاح میں کوشاں ہے،
می نمودند و آئینۂ دل را از غبار	اور دلوں سے گناہوں کی گندگی
ادناس آثام می زدودند، کثّر	دور کرتی ہے (خدا دنیا میں ان
فی الدنیا امثالھم و حسن فی	کی تعداد میں اور اضافہ کرے
الدنیا امثالھم و حسن فی العقبیٰ	اور عقبیٰ میں ان کا انجام اچھا
اٰمالھم و منالھم.	کرے)

اس زمانے میں ان بزرگوں نے قلم و قرطاس اور شمشیر و سنان کو ثانوی حیثیت دی اور نہایت سکون کے ساتھ اسلام کو دنیا کے کونے کونے میں پھیلایا، انھوں نے اپنے آرام کو تج دے کر عمر بھر سیاحت کی، اور دشت و جبل میں اذانیں دیں، اور ویرانوں اور بیابانوں میں خانقاہیں تعمیر کیں، اور اشاعتِ اسلام کے ایسے کارنامے انجام دیئے جو بڑے سے بڑے سلاطینِ اسلام کے تصور میں بھی نہ آئے ہوں گے، ان ہی بوریہ نشیں دینی خادموں میں امیر سید علی ہمدانی بھی ایک تھے، جو اپنے وقت کے صحیح معنوں میں سفیر کبیر اور جوال آفاق تھے۔

اسلام داخل ہونے سے قبل کشمیر کے سیاسی اور سماجی حالات

ان حالات کو مد نظر رکھ کر جب ہم اس زمانے کے کشمیر کے سیاسی اور سماجی حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ہندو تہذیب و سیاست کے خاتمہ کی علت بھی سمجھ میں آتی ہے، اور میر سید علی ہمدانی کی حیران کن کامیابی کا راز بھی معلوم ہوتا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ کشمیر کا معاشرہ

کسی دوسرے مذہب اور کسی دوسری تہذیب کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو گیا تھا، اور ٹھیک جس طرح ازمنۂ اولیٰ میں اسلام کے لیے دنیا سازگار ہوئی تھی، اور نہایت سرعت کے ساتھ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا، اسی طرح کشمیر بھی کسی تازہ پیغام کا منتظر تھا، آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) میں کشمیر میں ہندو تہذیب، حکومت اور ثقافت دم توڑ رہے تھے، ہر طرف زوال و انحطاط کے بادل منڈلا رہے تھے، لوگ طویل العمر مذہب سے دل برداشتہ ہو گئے تھے، سماج طبقات میں منقسم تھا، نچلی ذات کے طبقے مقہور و مظلوم تھے، مذہبی پیشوا چند رسوم میں مقید ہو گئے تھے، انھوں نے عوام الناس کو اوہامِ فاسدہ میں مبتلا کر رکھا تھا، علم و ادب کا بازار بے رونق ہو گیا تھا، جو کسی زمانے میں غیر ملکی اہلِ علم کے لیے بھی باعثِ جذب و کشش تھا، اس زمانے کی کشمیری شاعرہ للہ عارفہ کے ذریعہ سے وقت کے سماجی حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے، وہ اپنے زمانہ کی عظیم ترین کشمیری شاعرہ سمجھی جاتی ہیں، اور بلاشبہ اس کے اشعار اس کے ذہنی افق کی بے پناہ وسعت اور حساس طبیعت کے شاہد ہیں، ڈاکٹر پارمو للہ کی شاعری کے حوالہ سے لکھتے ہیں:-

"للہ کے کلام اور اس کی زندگی کے احوال و واقعات کا محتاط نظر سے مطالعہ کرکے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں کشمیر کی ہندو سوسائٹی مکمل طور پر بگڑی ہوئی تھی، مرد بدچلن اور بدکردار تھے، جبکہ عورتیں بھی اس سے زیادہ مختلف نہ تھیں، ہندو مذہب زیادہ تر شیو ازم کے اصول و قواعد کے گرد گھومتا تھا، لوگ عموماً نیز نجات، تمام غیر ذی روح اشیاء نیز چشموں اور دریاؤں پر ایمان و یقین رکھتے تھے، اور ان کی پوجا و پرستش

بھی اور یم طریقے پر ہوتی تھی، للہ کی قسمت کے لیے کشمیر کے برہمنی مذہب میں اصلاح کرنا لکھا تھا، للہ کی اصلاح کو بھی اس صدی کی اس مشہور اور مضبوط اصلاحی تحریک کا ایک حصہ بننا تھا، جس تحریک کے سربرآوردہ اور روح رواں رامانند، کبیر اور نانک جیسے لوگ تھے، للہ اس وقت تک اپنے برہمنی مذہب پر اسی طرح عمل کرتی تھی، جس طرح مذہبی پیشوا (گرو) تبلیغ کرتے تھے للہ نے بھی حسب دستور ریاضت اور نفس کشی پر عمل کیا، مگر یہ سب رسمی طریقے فضول اور بے کار ثابت ہوئے، اس نے اب مذہب کے ظاہری رسوم کے خلاف آواز بلند کی، اور درختوں، دریاؤں اور مندروں کے پتھروں اور بتوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، اس کے نزدیک مندر کے پتھر چکی کے پاٹ سے زیادہ بہتر نہیں ہیں، بت اس کے بقول تراشا ہوا پتھر ہے، مندر ان ہی پتھروں کا گھر ہے، بتوں کی پرستش بے ثمر اور غیر معقول ہے، حق کا عرفان صرف اسی صورت میں ہوگا جب اخلاص، پاکیزگی اور مساوات کی فضا پیدا کی جائے، اور پھر اسی فضا میں ذات سے نجات حاصل کرنے کی جد وجہد کی جائے، للہ نے شیوازم کی بھی مخالفت کی، جس پر اس زمانے کے پیشوایانِ مذہب عمل کرتے تھے، ان مذہبی پیشواؤں کے بارے میں للہ عارفہ کہتی ہے کہ یہ لوگ شعبدہ بازوں کے استاد ہیں، للہ تسلیم کرتی ہے کہ ان مذہبی پیشواؤں کی شعبدہ بازی طاقت ور ہے۔ یہ لوگ بہتی ہوئی ندی کو روک بھی سکتے ہیں، بھڑکتی ہوئی آگ بجھا سکتے ہیں، اور مصنوعی گائے سے دودھ حاصل کر سکتے ہیں، مگر یہ سارے کمالات جیسا کہ للہ نہایت نفرت اور حقارت کے ساتھ کہتی ہے،

مداری کے کھیل ہیں، اس قسم کی عبادت کے خلاف للہ نے آواز بلند کی، اس نے ریاکاری و مکاری پر مبنی عبادت، نفاق، تقشف اور خود ساختہ رسوم ولوازم کی علانیہ مذمت کی، للہ نے یوگا کا پرچار کیا"[1]

ایک مورخ ڈاکٹر ترشی نے درج ذیل الفاظ میں داخلۂ اسلام سے قبل کشمیر کے سیاسی اور سماجی حالات کا نقشہ کھینچا ہے۔

"کشمیر میں اسلام داخل ہونے سے تین سو سال قبل کی تاریخ بالخصوص سیاسی حالات افسوسناک اور نفرت انگیز ہیں، اصل میں تنزلِ عام نے یہاں اسی وقت سر نکالنا شروع کیا، جب سنگرام راجہ ۱۰۰۳ء میں لوہار خاندان کے بانی کی حیثیت سے منظر پر آیا، زندگی کے ہر شعبہ میں چاہے وہ سماجی ہو یا اقتصادی، تنزل و انحطاط شروع ہو کر پھیلنے لگا، ہرچند، اکالا، جے سمہا اور جگدیو جیسے مدبر حکمرانوں نے اصلاح و تنظیم کی جانب توجہ کی، مگر ان کی کامیابی بھی وقتی تھی، اور ۱۳۲۰ء میں عام بے چینی اور خلفشار کی کیفیت میں ہندو حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

معاصر تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کے باشندے چاہے وہ جوان ہوں یا عمر رسیدہ زندگی کی خوبیوں کو پسِ پشت ڈال کر سازشوں اور غلط کاریوں میں ڈوب گئے تھے، جس سے مہذب سوسائٹی کا حلیہ ہی بگڑ گیا تھا، اخلاقی بے راہ روی تمام لوگوں کی طبیعتوں میں رچ بس گئی تھی کشمیر کا ایک راجہ کلاسا ۱۰۶۳ء تا ۱۰۸۹ء ایسی بے لگام شہوت اور

---

[1] A History of Muslim Rule in Kashmir P. 11 - 111

خودسری کا عادی تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی عصمت لوٹنے کی حد پر جا پہونچا، اس
کا تابع حکمراں ہرشا (۱۰۸۹ء تا ۱۱۰۱ء) اخلاقی لحاظ سے اتنا گرا ہوا تھا کہ
اس نے محرمات یعنی اپنی بہنوں اور پھوپھیوں کے ساتھ بھی شادی
رچائی، اس عہد کے دوسرے حکمراں بھی سست، نااہل اور احمق
ثابت ہوا کرتے تھے، ان خامیوں کی بنا پر وہ اپنے طاقتور وزیروں
اور بڑے جاگیرداروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن گئے تھے، یہ وزیر
اور جاگیردار بادشاہ گر کا اونچا مقام حاصل کر چکے تھے، انتشار پسند
طاقتوں کے ابھرنے اور مملکت کی نزاعوں، سازشوں، بغاوتوں اور ہلاکت آمیز
جنگوں نے کشمیر کو تباہ اور درہم برہم کر دیا تھا، اس صورتِ حال میں کشمیر کا ملک
ایسی زمین بن گئی جس کی نہ کوئی پونجی تھی اور نہ سرمایہ اور جو وزیروں
اور جاگیردار نما ڈاکوؤں سے بھر گئی تھی، ان حالات میں نظم و قانون
کو قابو میں لانا محال بن گیا تھا، اور لوگوں کا جان و مال غیر محفوظ رہ گیا
تھا، عام لوگ جابر و حریص وزیروں اور افسروں کے ہاتھوں غیر انسانی
مظالم اور اقتصادی استحصال کے ہدف بن گئے تھے، مملکت کے اونچے
عہدے دار سرکاری ملکیت کو خورد برد کرتے، مندروں کی دولت لوٹتے اور
دیہاتی باشندوں سے نقد و جنس چھینتے تھے، لوگ بھاری ٹیکسوں اور دوسرے
غیر مساوی مطالبات کے نیچے دب کر کراہتے رہتے تھے، داخلی بدنظمی نے اندرونی
تجارت کو درہم برہم کر دیا تھا، اور بعض اوقات بیرونی تجارت بھی مکمل طور
پر معطل ہو گئی تھی، مورخ کلہن تاجروں کے حرص و آز اور ان کی بدنیتی

کی طرف بھی اپنی تاریخ میں اشارہ کرتا ہے۔[ط]

میر سید علی ہمدانی اور ورودِ کشمیر

یہ تھے وہ حالات جن میں کشمیر کی سرزمین مکمل طور پر الجھی ہوئی تھی،
کشمیر سے ملحق بیرونی ممالک کے سلاطین کشمیر کے سارے حالات سے باخبر
تھے، سیاح تاجر اور مبلغ دوسرے راستوں سے یہاں داخل ہوتے تھے، اور صوفیائے
کرام بھی آئے دن یہاں وارد ہوتے رہتے تھے، اسی لیے میر سید علی ہمدانی نے یہاں
کی تبلیغی خدمات میں گہری دلچسپی لی، اور اس میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔

پروفیسر آرنلڈ T. W. Arnold نے لکھا ہے کہ امیر کبیر میر سید علی ہمدانی
کشمیر وارد ہونے کا باعث امیر تیمور کے قہر و غضب سے بچاؤ حاصل کرنا تھا، مگر اس کی
تائید کسی بھی قدیم ذریعہ سے نہیں ہوتی ہے، شیخ ہمدانی عمر بھر سیاستِ وقت سے
کنارہ کش رہے، وہ دین کے خادم اور روحانی پیشوا تھے، ان کے لیے ہر ملک ملکِ خدا
ہونے کی وجہ سے کسی بادشاہ کی اعانت یا کسی کی مخالفت کرنا غیر ضروری تھا، اور کسی
حکمراں سے ٹکر لینے کا ان کے ہاں سوال بھی پیدا نہ ہوتا تھا، وہ حکمرانوں کے محتاج
نہیں تھے بلکہ سلاطینِ وقت ہی ان کی معاونت کے طالب ہوئے، پھر تاریخی اعتبار سے
بھی اس کی تائید نہیں ہوتی ہے، امیر تیمور ۱۳۳۶ء میں تولد ہوا تھا، اس وقت شیخ
ہمدانی کی عمر ۲۲ سال کی تھی، امیر تیمور کو سلطنت حاصل کرنے کے لیے ہی زندگی کا ایک
معتد بہ حصہ دوڑ دھوپ میں صرف کرنا پڑا، جب اس نے توسیعِ مملکت کی طرف
توجہ کی تو اس وقت شیخ ہمدانی کا انتقال ہو چکا تھا، یعنی شیخ ہمدانی کا انتقال

ط S Zain ul Abidin Of Kashmir Dr. N. K. Zutshi. P. 4.5

۷۹۹ھ یا ۸۰۰ھ میں ہوا، اور امیر تیمور نے ۸۰۰ھ میں ہندوستان کی جانب توجہ کی، اور وہ ۸۰۱ھ میں دہلی پر قابض ہوا، ۸۰۳ھ میں دمشق، حلب اور بغداد کو اپنے قبضے میں لایا، اس کے بعد ایشیائے کوچک (Asia Minor) کی طرف متوجہ ہو کر بایزید اول (یلدرم) کو شکست دی، امیر تیمور نے ۸۰۷ھ مطابق ۱۴۰۵ء میں وفات پائی، غرض امیر تیمور کا شیخ ہمدانی جیسے بزرگ کو ستانا صحیح نہیں معلوم ہوتا، البتہ اس میں شک نہیں ہے کہ تیمور ابتداء میں ایرانیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، اس میں سادات (چاہے وہ علوی ہوں یا فاطمی) اور غیر سادات کا کوئی امتیاز نہیں تھا،

پروفیسر آرنلڈ کے علاوہ شیخ ہمدانی کے نہایت قدیم سوانح نگار مولانا حیدر بدخشی لکھتے ہیں:۔

امیر کبیر سید علی ہمدانی رو بقبلہ	امیر کبیر سید علی ہمدانی قبلہ رو بیٹھے
نشستہ بودند کہ حضرت رسول اکرمؐ	ہوئے تھے کہ آنحضرتؐ تشریف فرما
حاضر شدند و گفتند یا ولدی	ہوئے، فرمایا: میرے بیٹے تو کشمیر
در کشمیر رو و مردم آنجا مسلمان	جا، اور یہاں کے لوگوں کو مسلمان
کن، اگرچہ بعضی بشرفِ اسلام	بناؤ، اگرچہ ان میں کچھ اسلام لاچکے
مشرف اند اما بدتر از کافر	ہیں، مگر عملی اعتبار سے غیر مسلموں
(منقبۃ الجواہر قلمی)	سے بھی بدتر ہیں۔

واللہ اعلم اس حقیقت میں کتنی عقیدت ہے، البتہ شیخ ہمدانی کی کامیابی یقیناً غیبی تائید سے مؤید تھی۔

پہلی سیاحت | شیخ ہمدانی سب سے پہلے ۷۷۴ھ میں کشمیر تشریف لائے، یہ زمانہ سلطان

شہاب الدین کا عہدِ حکومت تھا، اگرچہ اس سیاحت کا کوئی غیر معمولی واقعہ شیخ ہمدانی کی سوانح یا تواریخِ کشمیر میں نہیں ملتا ہے، مگر ہمیں سلطان شہاب الدین کی زندگی اور حکمرانی میں ایک گونہ انقلاب نظر آتا ہے، شہاب الدین اپنی عظمت وجلالت میں تمام سلاطینِ کشمیر میں ممتاز و منفرد تھا، اس نے بگڑی ہوئی سلطنت جس شان سے منظم کی اور مملکت کے حدود کو وسعت دینے میں جس شجاعت و صلاحیت کا ثبوت دیا، اس لحاظ سے وہ یقیناً کشمیر کے قدیم راجہ للتادتیہ کا ثانی تھا، سلطان نے فتح و تسخیر کی ابتدا پکھلی، سوات، گبر، تبت، دوسری طرف کشتواڑ اور جموں، آگے پشاور ہوتے ہوئے کابل، بدخشاں، دامغان، غزنین، غور، قندھار میں اپنی فتح و نصرت کے خیمے نصب کیے، آگے کوہ ہندوکش تک پہونچا، واپسی پر پورے پنجاب کو اپنے قبضے میں لایا، اور دہلی پر دھاوا بولنے لگا، اسی زمانے میں جب سلطان اپنی شجاعت اور وسعت سلطنت میں بلند مقام پر فائز ہو رہا تھا حضرت میر علی ہمدانی تائیدِ غیبی کے علاوہ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے موقع و محل کے بھی منتظر تھے، چنانچہ عین اس وقت جب دہلی کے حکمراں سلطان فیروز شاہ تغلق اور کشمیر کے سلطان شہاب الدین کے درمیان لڑائی شروع ہوئی، میر سید علی ہمدانی نے ان دونوں حکمرانوں کے درمیان مصالحت اور تعلقات قائم کرنے کے لیے دروازہ کھول دیا، اس کے علاوہ سلطان شہاب الدین کی فوج میں بیہقی سادات بھی تھے، جن میں سید تاج الدین بیہقی کے فرزند میر سید حسن بیہقی امیر لشکر تھے، یہ بیہقی سادات شیخ ہمدانی کے متعلقین اور اقارب تھے، ممکن ہے کہ کشمیری حکمراں کے لشکر میں بیہقی سادات کے اس عمل دخل کے پیچھے میر سید علی ہمدانی کی سیاسی بصیرت بھی کارفرما رہی ہوگی، اسی طرح سلطان شہاب الدین نے اپنی حکمرانی کے آخری دور میں اسلام کی اشاعت میں شدت اختیار کی تھی، جیساکہ مورخ حسن نے لکھا ہے،

"آخر عمر در تخریب بت خانہا افتادہ، بت خانہ بجبشور کہ دہ بجبارہ بسیار مرتفع بود شکستہ و در نفس شہر ہر جا کہ بت خانہائے ہنوز موجود بود ویران ساخت"[1]

اس تغیرِ حال کے پیچھے بھی میر سید علی ہمدانی کی اصلاح اور تبلیغ کا اثر اور دخل تھا، پہلی سیاحت کے دوران شیخ ہمدانی نے تھوڑے ہی وقت کے لیے قیام کیا، اس دوران میں وہ منظرِ عام پر نہیں آئے، البتہ حالات کا گہرا جائزہ لیا، اور حکمرانوں کی پشت پناہی حاصل کرنے کے لیے کامیاب کوشش کی۔

دوسری سیاحت | تین یا چار سال بعد شیخ ہمدانی نے [illegible] میں کشمیر کی جانب دوبارہ توجہ کی، اس مرتبہ وہ پورے عزم کے ساتھ یہاں تشریف لائے، انھوں نے اپنے ساتھ وسطِ ایشیا کے بلند رتبہ علما، مبلغین، روحانی پیشوا، ماہرین صنعت وحرفت، سرکردہ اور صالح فنکاروں کی ایک بڑی جماعت اپنی سربراہی میں یہاں لائے۔ اس وقت حکومتِ کشمیر کی باگ ڈور سلطان قطب الدین کے ہاتھ میں تھی، سلطان، شیخ ہمدانی سے پہلے ہی متعارف اور ان کے مرتبہ سے واقف تھا، جب اس نے شیخ ہمدانی کی تشریف آوری کی خبر سنی تو وہ آگے بڑھ کر اُن کے استقبال کے لیے نکلا، شیخ ہمدانی نے بڑی آسانی کے ساتھ اپنے رفقا کو کشمیر کے مختلف مقامات میں پھیلایا، اور انھیں مقامی لوگوں کی اصلاح وتربیت کا کام سونپا، ان لوگوں نے مسجدوں اور خانقاہوں کی تعمیر کی جانب توجہ کی، اور لوگوں کو نئے دین اور نئی تہذیب سے روشناس کیا، خود شیخ ہمدانی ذہبی شہر کے مرکز میں دریا کے کنارے مصلّٰی بچھایا، اور رہیں ریاضت و عبادت کے ساتھ بڑے زور وشور سے لوگوں کو دائرۂ اسلام میں داخل کیا، ان کی بے لوث دعوتِ حق اور للہیت کو دیکھ کر لوگوں نے جوق درجوق اسلام قبول کیا، یہ مقام بعد میں کشمیر کا

---

[1] تاریخ حسن ج ۲ -

عظیم الشان تبلیغی مرکز بن گیا، چند مورخین اور تذکرہ نگاروں نے میر سید علی ہمدانی کے بعض رفقا کا مختصر تذکرہ کیا ہے، ہم ان میں چند حضرات کا مختصر الفاظ میں تعارف پیش کرتے ہیں۔

میر سید حسین سامانی | شیخ داؤد مشکوتی ان کی شان میں کہتے ہیں :-

آنکہ بر صلب و رخا دستِ تصرف داشتہ   در دلِ روشن در آں تخمِ محبت کاشتہ

از ہمہ کون و مکاں در حق نظر بگماشتہ   حضرتِ سید حسین از دیں لوا افراشتہ

ایران کے رہنے والے تھے، ہرات سے تعلق رکھتے تھے، سلطان شہاب الدین کے عہدِ حکومت میں حضرت میر سید علی ہمدانی کے اشارے پر کشمیر تشریف لائے، ان کے ساتھ ان کے اہلِ خانہ بھی تھے، موضع کولہ گام (واقع ضلع اسلام آباد) میں دریا کے کنارے اقامت کی، یہاں اپنے علم وفضل اور زہد وتقویٰ میں مرجعِ خلائق ہوئے، حضرت شیخ نور الدین ریشی کشمیری بھی ان سے استفادہ کرتے تھے، دونوں بزرگ روحانیت کے بلند مقام پر فائز تھے، تذکرہ نگاروں نے ان کی کئی کرامتیں نقل کی ہیں[1] (۱)

---

[1] اسرار الابرار قلمی، و تاریخ کشمیر اعظمی ص ۳۰، لاہور ۱۳۰۳ھ۔

مکاتیب شبلیؒ

مولانا مرحوم کے دوستوں، عزیزوں، شاگردوں کے نام خطوط کا مجموعہ جس میں مولانا کے تمام ملی وقومی خیالات، اور علمی، تعلیمی اور ادبی نکات یکجا ہو گئے ہیں، یہ درحقیقت مسلمانوں کی تیس[illegible] سالہ اجتماعی جدوجہد کی مسلسل تاریخ ہے، قیمت جلد اول   قیمت جلد دوم   روپے

"منیجر"

دار العلوم دیوبند کا صد سالہ اجلاس

از

ضیاء الدین اصلاحی

دار العلوم دیوبند میں اس کا صد سالہ اجلاس ۲۱ / ۲۲ / ۲۳ / مارچ سنہ ۱۹۸۰ء کو دھوم دھام سے ہوا، یہ عظیم الشان اجلاس دار العلوم کا چھٹا جلسۂ دستار بندی (کانووکیشن) بھی تھا، اس کا پانچواں اجلاس ستر بہتر برس پہلے سنہ ۱۳۲۸ھ مطابق سنہ ۱۹۱۰ء میں ہوا تھا، اس کے بعد سے پھر کوئی اجلاس نہیں ہو سکا، اس صد سالہ جشن کا غلغلہ گذشتہ کئی برسوں سے بپا تھا مگر یہ برابر ملتوی ہوتا رہا، اب دار العلوم کے قیام کو سو برس سے زیادہ ہو چکا ہے اور چودھویں صدی ہجری ختم اور پندرھویں شروع ہونے والی ہے، اس لئے اجلاس میں اب مزید تاخیر مناسب نہیں سمجھی گئی۔

دار العلوم دیوبند ایک عالمی درسگاہ ہے، اس کی شہرت اس برصغیر کے علاوہ بیرونی ممالک تک پہنچ چکی ہے اس لئے اس کے اجلاس میں بین الاقوامی رنگ پیدا ہو گیا تھا، اس میں افغانستان کو چھوڑ کر تقریباً پوری اسلامی دنیا کے نمایندے شریک تھے،

ہندوستان کے گوشے گوشے سے دار العلوم کے قدردان اس کی تقریبات میں شرکت کے لئے ٹوٹ پڑے تھے،

محتاط اندازہ کے مطابق ہندوستان کے طول و عرض، مغربی ایشیا، افریقہ، یورپ اور لاطینی

امریکہ کے تقریباً پانچ لاکھ مسلمان اس اجلاس میں شریک ہوئے۔ غالباً مسلمانان ہند کا اس سے بڑا علمی، تعلیمی اور دینی اجتماع کبھی نہیں ہوا تھا،

شرکائے اجلاس میں سات ہزار فضلائے دار العلوم بھی تھے جن کی دستار بندی ہوئی، ہندی، انگریزی اور اردو اخباروں کے نامہ نگار، آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ و دہلی اور پاکستان ریڈیو کے نمایندے بھی بڑی تعداد میں شریک تھے،

دار العلوم نے دس ہزار سے زیادہ افراد کے کھانے اور ناشتے کا خود انتظام کیا تھا، مدرسہ اصغریہ دیوبند اور مسلمانان دیوبند نے بھی ہزاروں مہمانوں کی ضیافت کی، اس کے علاوہ لگ بھگ سو ہوٹل بھی تھے،

تقریبات کے لئے دار العلوم سے ملحق شمال و مغرب جانب موضع قاسم پور کی بارہ سو بیگہ اراضی کرایے پر حاصل کی گئی تھی، اس میں اکثر بڑے بڑے کیمپ خود دار العلوم نے لگائے تھے اور دوسری رفاہی تنظیموں کی طرف سے بھی کیمپ نصب کئے گئے تھے۔ جن میں شرکائے اجلاس کو جلسہ گاہ کے قریب ضلع وار اور صوبہ وار ٹھہرایا گیا تھا، روشنی اور پانی وغیرہ کا مناسب بند و بست تھا، دار العلوم کے زیر نگرانی ایک طبیہ کالج بھی عرصہ سے قائم ہے، اس کی عمارت میں طبی امداد کے لئے ایک اسپتال کا انتظام کیا گیا تھا، جلسہ ایک نہایت وسیع و عریض پنڈال میں ہوا، جس میں تقریباً ڈیڑھ دو لاکھ آدمیوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا مگر یہ ناکافی ثابت ہوا،

حکومت ہند نے شرکائے اجلاس کی سہولت کے پیش نظر کنسیشن فارم جاری کئے تھے اور بعض مرکزی اور اہم شہروں سے اسپیشل ٹرینیں چلائی گئی تھیں، اسٹیشن سے مہمانوں کو لانے کے لئے بسوں، کاروں اور جیپوں کا بھی انتظام تھا

پورا قصبہ بلا امتیاز مذہب و ملت مہمانوں کے لئے فرش راہ بنا ہوا تھا مگر خود منتظمین کو اتنے

بڑے مجمع کی توقع نہ تھی، اس لئے نظم وضبط پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا،

۲۱ر مارچ کو جمعہ تھا، مختلف کیمپوں اور مسجدوں میں بھی جمعہ کی نماز ہوئی، سب سے بڑی جماعت جلسہ گاہ کے پنڈال میں ہوئی، جہاں لاکھوں شرکاء نے مولانا قاری محمد طیب مہتمم دار العلوم دیوبند کی اقتداء میں نماز جمعہ ادا کی۔

پہلا اجلاس جمعہ کی نماز کے بعد سعودی عرب کے شیخ عبد اللہ المحسن ترکی کی صدارت میں ہوا، وہ ریاض یونیورسٹی کے چانسلر اور سعودی عرب کے فرماں روا شاہ خالد کے خاص نمائندے تھے، سب سے پہلے مصر کے قاری عبد الباسط عبد الصمد نے قرآن پاک کی تلاوت کی، جن کی سامعہ نواز اور دل نواز قرأت سے پورا مجمع متاثر تھا، ان کا شمار دنیا کے ممتاز قاریوں میں ہوتا ہے، ان کے بعد کویت کے وزیر اوقاف شیخ یوسف جی نے اجلاس کا رسمی افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ دار العلوم کے بزرگوں نے اسلام اور مسلمانوں کی بڑی خدمت کی، پھر مولانا قاری محمد طیب صاحب نے اپنا خطبۂ استقبالیہ پڑھا

خطبۂ استقبالیہ کے بعد صدر نے شاہ خالد اور ولی عہد شاہزادہ فہد کا تہنیتی پیغام پیش کیا، انھوں نے اسلامی تعلیمات کی اشاعت کے سلسلہ میں دار العلوم کی مفید خدمات اور اس کے اکابر کے کارناموں کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا کہ جو چیز ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے تکلیف دہ ہوگی وہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے لئے اذیت کا باعث ہوگی،

شیخ عبد اللہ المحسن ترکی نے اپنی حکومت کی طرف سے دار العلوم دیوبند کو بیس لاکھ روپیے کی پیشکش کی، اسی اجلاس میں عراق کے نمائندے نے بھی دار العلوم کے لئے چار لاکھ ساٹھ ہزار روپیے کے عطیے کا اعلان کیا، کویت کی حکومت کی طرف سے چھ لاکھ روپیے کا عطیہ دیا گیا، بعض اور حکومتوں نے بھی دار العلوم کو رقمیں دیں،

ہندوستان کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی بھی اس اجلاس میں شریک تھیں، گو بعض حلقوں

میں ان کی شرکت کو تعجب انگیز سمجھا گیا، مگر ان کی تقریر عام طور سے پسند کی گئی جو شستہ و شگفتہ اردو میں تھی، انھوں نے قومی بیداری اور ملک کی آزادی کی جدوجہد میں دار العلوم دیوبند کی خدمات کا اعتراف کرنے کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کے گوناگوں کارناموں اور قابل فخر یادگاروں کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ مسلمانوں نے ہندوستانی زندگی کے مختلف شعبوں پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں، ہم کو بھی ان پر فخر ہے، ان سے ہندوستان کو طاقت ملی،

۲۲ر مارچ کو دو عام اجلاس ہوئے اور ۲۳ر مارچ کو پانچواں اور آخری عام اجلاس ہو کر دوپہر میں یہ سہ روزہ تقریبات ختم ہو گئیں، یہ سب اجلاس عرب ملکوں کے نمایندوں کی صدارت میں ہوئے اور مختلف ملکوں کے نمایندوں، دار العلوم دیوبند کی شوریٰ کے بعض ارکان و اساتذہ نے کارروائی میں حصہ لیا، روس کی نمایندگی وسطی ایشیا و قزاقستان کے مسلم مذہبی بورڈ کے وائس چیرمین ڈاکٹر یوسف شاکردوف نے کی، یہ بورڈ دنیا کی مسلم تنظیموں کے ساتھ دوستانہ اور برادرانہ تعلقات کے لئے قائم ہوا ہے، ڈاکٹر یوسف نے تقریر شروع کی تو مجمع سے "افغانی مجاہدین زندہ باد، اور روس افغانستان سے واپس جاؤ" کی آوازیں سنائی دیں، اس پر اسٹیج سکریٹری نے کہا کہ ہم حاضرین کی ترجمانی کرتے ہوئے روسی نمایندہ سے گذارش کرتے ہیں کہ وہ ہمارے جذبات اپنی حکومت تک پہنچادیں اور اس کو بتادیں کہ ہم افغانستان میں روسی مداخلت کو سخت ناپسند کرتے ہیں،

ہندوستان کے علماء میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور پاکستانی علماء میں مولانا مفتی محمود اور مولانا غلام اللہ خاں کی تقریریں عام طور سے پسند کی گئیں،

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کو اللہ تعالیٰ نے جہاں گوناگوں کمالات اور خوبیوں سے نوازا ہے وہاں ان کو تقریر وخطابت کا بھی بڑا ملکہ عطا کیا ہے، ان کی ہر تقریر کی طرح یہ تقریر بھی نہایت موثر ولولہ انگیز اور از دل خیزد بر دل ریزد کا مصداق تھی، انھوں نے بے مثال مجمع اور حاضرین کی غیر معمولی

تعداد سے متاثر ہو کر اپنی تقریر قرآن مجید کی اس آیت سے شروع کی۔

وَاذْكُرُوا إِذْ أَنْتُمْ قَلِيلٌ مُسْتَضْعَفُونَ	اور یاد کرو اس وقت کو جب تم زمین میں
فِي الْأَرْضِ تَخَافُونَ أَنْ يَتَخَطَّفَكُمُ	قلیل اور ضعیف سمجھے جاتے تھے اور
النَّاسُ فَآوَاكُمْ وَأَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهِ وَ	ڈرتے رہتے تھے کہ لوگ تمہیں اچک
رَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ	نہ لیں تو اللہ نے تم کو جگہ دی اور اپنی
تَشْكُرُونَ ۝	مدد سے تم کو قوت بخشی اور پاکیزہ چیزیں
(انفال : ۲۶)	کھانے کو دیں تاکہ اس کا شکر کرو۔

اور فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے یہ آیت اس وقت الہام کر دی گئی ہے، انھوں نے مسلمانوں کا اصلی اثاثہ اور مابہ الامتیاز سرمایہ دین کو بتاتے ہوئے کہا کہ میں عربوں سے بھی یہ بات بار بار کہی ہے کہ آپ کو اسی دین کی بدولت اعزاز و اکرام حاصل ہوا تھا، آپ جب اس کی دعوت لے کر اٹھے تو ساری دنیا سے افضل و برتر سمجھے گئے اور آج اسی دین سے تعلق کم ہونے کی بنا پر ہم کو ناکامیوں اور محرومیوں سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے، دارالعلوم دیوبند کا قیام دین ہی کی حفاظت کے لئے عمل میں آیا تھا، اس کا یہ جشن اس عظیم جہاد کی یاد دلاتا ہے جو ایک صدی پہلے کفر و الحاد کے اندھیروں کے خلاف شروع کیا گیا تھا، مولانا علی میاں نے کہا کہ مسلمان اس ملک میں فاتح کی حیثیت سے آئے تھے، انہوں نے اس ملک کو تہذیب، تمدن، زبان، خوبصورت اور پرشکوہ عمارتیں دے کر گل و گلزار بنا دیا، یہاں مختلف تہذیبیں آئیں مگر ان کا پتہ اور نشان تک باقی نہیں مگر اسلام باقی ہے اور مسلمانوں کی تہذیب بھی باقی ہے، اس وقت یہ ملک اخلاقی اور سیاسی اعتبار سے جس دلدل میں پھنس گیا ہے اور ملک کی اجتماعی زندگی میں جو گندگی بھر گئی ہے اس کی صفائی صرف مسلمان ہی کر سکتے ہیں، ان کو یہیں جینا اور مرنا ہے اور اپنے دینی امتیاز اور ملی تشخص

کو بھی برقرار رکھنا ہے، وہ کسی حال میں بھی نہ اسلامی تہذیب و تمدن کی کسی یادگار کو چھوڑنا گوارا کریں گے اور نہ اپنے کو اس ملک کے قومی دھارے میں ضم ہونے دیں گے، مسلمان کسی سیاسی پارٹی کے رحم و کرم پر نہیں جی رہے ہیں بلکہ اُن کی حفاظت خدا کر رہا ہے، آج اگر اس ملک میں مسلمانوں کو رہنا اور باعزت زندگی بسر کرنا ہے تو پہلے اپنے خدا پر، پھر اپنے آپ پر اعتماد کرنا چاہئے، کسی سیاسی جماعت اور نظام کے اندر اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ ان کو زندہ رکھے یا ختم کرے،

آخر میں مولانا نے دارالعلوم دیوبند کی ان چار امتیازی خصوصیات کا ذکر کیا (۱) توحید خالص (۲) اتباعِ سنت (۳) تعلق باللہ (۴) اعلاء کلمۃ اللہ، اور پھر ہر ایک کی نہایت موثر اور دل نشین تشریح کی،

مولانا کی اس ایمان پرور تقریر سے مسلمانوں کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوئی اور ان کو اپنی عظمت کا احساس ہوا یہ تقریر بہت پسند کی گئی اور اس مدد و زہ اجلاس کا حاصل سمجھی گئی

اسی اجلاس سے مشہور پاکستانی عالم اور نامور سیاسی رہنما مولانا مفتی محمود نے بھی خطاب کیا، ان کی تعلیم دیوبند ہی میں ہوئی تھی مگر ان کو ۳۵ سال بعد ہندوستان آنے اور اپنی مادر علمی کو دیکھنے کا موقع ملا تھا مفتی صاحب نے بتایا کہ پاکستان کے ساڑھے تین سو مدارس کا ایک وفاق قائم ہے، انھوں نے تجویز پیش کی کہ جس طرح کا اجتماع اس وقت دیوبند میں ہو رہا ہے، اسی طرح کا اجتماع پاکستان اور بنگلہ دیش میں بھی کیا جانا چاہیے، انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ توحید و اتباعِ سنت پر اصل زور دینا چاہئے اور نزاعی مسائل سے پرہیز کیا جانا چاہئے اور ان میں اعتدال پیدا کیا جانا چاہئے، ان کی تقریر بھی عام طور پر پسند کی گئی،

اس اجتماع میں مختلف ملکوں کے صدور مملکت اور سربراہوں کے پیغامات بھی پڑھ کر سنائے گئے جن میں پاکستان کے جنرل ضیاء الحق، مصر کے انوار السادات، اور ہندوستان کے صدر

نیلم سنجیوا ریڈی کے پیغام بھی تھے، اجلاس سے بابو جگ جیون رام اور راج نرائن نے بھی خطاب کیا، جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ شیخ عبد اللہ نے اپنے صاحبزادے ڈاکٹر فاروق عبد اللہ کو اپنی نمائندگی کے لئے بھیجا تھا، انھوں نے دار العلوم دیوبند کو دو لاکھ کا عطیہ بھی دیا،

اجلاس کے موقع پر کتابوں کی نمائش کا اہتمام بھی کیا گیا تھا، دار العلوم کا کتب خانہ بڑا ہے اور اس میں مخطوطات و نوادر کا بھی اچھا ذخیرہ ہے اس لئے یہ نمائش اہل علم اور اچھے ذوق کی دلچسپی کا مرکز رہی،

سہ روزہ اجلاس کے درمیان ۲۲ مارچ کو "دینی تعلیم اور عہد حاضر کے تقاضے" کے عنوان سے سمینار کے دو اجلاس ہوئے، پہلا جلسہ دن میں ۳ بجے مولانا سعید احمد اکبرآبادی ایڈیٹر برہان کی صدارت میں اور دوسرا رات کو ۹ بجے مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی صدارت میں ہوا، جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن ناظم دار المصنفین بعض موانع کی بناپر دار العلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس میں شرکت نہیں فرما سکے تھے ان کو سمینار میں بھی مدعو کیا گیا تھا، انھوں نے اپنا مقالہ "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تاریخی مدارس" راقم کو دیدیا تھا جس کو راقم نے وہاں پڑھا سامعین نے بڑے غور سے سنا، اس میں مسلمان حکمرانوں کے دور کے بعض عظیم الشان مدرسوں کا ذکر کر کے یہ بتایا گیا تھا کہ ان سے جو جید علماء فارغ ہوئے ان میں بعض قاضی ابو یوسف، امام محمد، امام غزالی اور امام الحرمین وغیرہ کے ہم پایہ تھے، مگر اب یہ سب مدارس معدوم ہو چکے ہیں یہاں تک کہ ان کے کھنڈر بھی باقی نہ رہے، آخر اس کے اسباب کیا ہیں؛ مقالہ نگار کے نزدیک اس کا یہ جواب تشفی بخش نہیں ہے کہ جب مسلم سلاطین کی حکومتیں ختم ہوئیں تو ان کی سرپرستی سے محروم ہو جانے کی بناپر یہ مدارس بھی ختم ہو گئے، انھوں نے مورخانہ اور ناقدانہ تجزیہ کر کے ثابت کیا ہے کہ ان مدرسوں کے باقی نہ رہنے کی ذمہ داری سے علمائے کرام بری قرار نہیں دیے جا سکتے۔

۲۳ مارچ کو آخری اجلاس ہوا، اس میں مولانا منت اللہ رحمانی امیر شریعت بہار و اڑیسہ و جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے وہ تجویزیں پڑھ کر سنائیں جو اس اجلاس میں منظور کی گئیں۔

ایک اہم تجویز یہ تھی کہ اسلام کی دعوت و سربلندی نیز دنیا کو درپیش موجودہ نئے مسائل کے حل کے لئے ایسے علماء تیار کئے جائیں جو علوم نبوت سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ ہی جدید علوم، سائنس، ٹکنالوجی سے بھی واقف ہوں اور موجودہ دور کے حالات اور نزاکتوں سے بھی باخبر ہوں تاکہ وہ امت کی علمی، فکری، دینی اور اجتماعی رہنمائی کر سکیں،

اس کے ساتھ ہی یہ تجویز تھی کہ دار العلوم موجودہ بدلے ہوئے حالات میں جدید مسائل کو اسلامی شریعت کے مطابق حل کرنے کے لئے فقہ اسلامی میں تخصص کا ایک شعبہ قائم کرے، جس میں فقہ، اصول فقہ، فلسفۂ قانون، قواعد و کلیات دین اور مختلف ائمہ کے مناہج و استنباط کے تقابلی مطالعہ کا اہتمام ہو۔

فلسطین اور افغانستان کے مسلمانوں کی حمایت میں بھی تجویزیں منظور کی گئی تھیں۔

اگر اس بڑے اجتماع میں کچھ بے لطفی اور تلخی بھی پیدا ہو گئی ہو تو وہ ذکر کے لائق نہیں، اس اجتماع سے جہاں دار العلوم کی غیر معمولی مقبولیت کا اندازہ ہوا وہیں اس کی گوناگوں ذمہ داریوں کا بھی پتہ چلتا ہے جن کو اس اجتماع نے اور بڑھا دیا ہے، قوم و ملت نے جس شان اور گرم جوشی سے اس کی دعوت پر لبیک کہا ہے، یقین ہے کہ اسی شان اور گرم جوشی سے وہ اس کی قیادت اور رہنمائی بھی قبول کرے گی، دار العلوم کو ملت کے اس اعتماد کو ہر حال میں باقی رکھنا ہوگا۔ مسلمان اس وقت جن حالات سے دوچار ہیں ان میں انکی صحیح رہنمائی بہت ضروری ہے۔ اس کا حق سب سے زیادہ دار العلوم ہی کو ہے جسکی گوناگوں، قدیم اور اہم روایات ہیں،

علمی خطوط

(۱)

محترم و مکرم حضرت سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب

السلام علیکم   مزاج گرامی

جزاکم اللہ، حضرت مولانا علی میاں صاحب کے تعارف میں ان کی کتابوں پر خوب تبصرہ فرمایا۔ کاروان مدینہ پر جی چاہتا تھا کہ مزید آپ کے قلم سے کچھ ہوتا۔ حضرت رائے پوری ان کے شیخ تھے سوانح کے تعارف میں یہ بھی آجاتا۔ سوانح مولانا محمد الیاس صاحبؒ پر حضرت سید صاحبؒ کا مقدمہ عجیب و عظیم ہے، اس کا تذکرہ ضروری ہے، سپاس نامہ تیرہ حیات میں دیکھا، معارف میں اگر آئے تو حضرت مولانا کا جواب جو انھوں نے بیان فرمایا تھا وہ بھی آنا چاہئے، سیرت پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ساتویں جلد کی زیارت سے تکیہ میں آنکھیں شاد ہوئیں، آپ کے لئے خوب دل سے دعا نکلی۔ اس کی داستان آپ کو سنادوں، حضرت مخدوم سید صاحبؒ کے قیام بھوپال و کراچی میں بندہ بار بار حضرت سے عرض کرتا رہا کہ ساتویں جلد پوری فرمادیں، سید صاحبؒ بھی فرماتے رہے کہ وہ ضروری ہے، ذرا سکون ملے تو اسے کردوں۔ وفات کے بعد حضرت شاہ معین الدین صاحبؒ سے کئی بار خطوں سے اور زبانی بھی عرض کرتا رہا کہ آپ حضرت سید صاحبؒ کے جانشین ہیں اس لئے ساتویں جلد پوری فرمائیں، کراچی جب بھی جانا ہوا صاحبزادہ گرامی سید سلمان میاں سلمہٗ سے تقاضا کرتا رہا کہ جتنا حضرت نے تحریر فرمایا ہے وہ شائع ہوجانا چاہئے، مولانا غلام محمد صاحب کے ذریعہ والدہ صاحبہ کی خدمت میں بھی گذارش

کرتا رہا، اب معارف میں اس کے شائع ہونے سے بڑی خوشی و مسرت ہوئی، یہ بھی اس میں لکھا تھا کہ کسی دوسرے نام سے طبع ہوگی یہ بات ہرگز مناسب نہ ہوتی، الحمدللہ کہ وہ ساتویں جلد کے نام سے ہی طبع ہوئی، حق تعالیٰ آپ کو بہت ہی جزائے خیر عطا فرمائے، انشاء اللہ کل قیامت میں آپ حضرات سیرت نگارؒ کے سامنے سرخ رو ہونگے، خدا کرے اس کی تکمیل بھی آپکے ہاتھوں سے ہوجائے۔

سنہ ۱۹۴۹ء حضرت سید صاحبؒ کے آخری سفر حج میں مدینہ پاک میں سید صاحبؒ صفہ کے چبوترے کے نزدیک تشریف فرما تھے، بندہ حاضر خدمت ہوا تو فرمایا کہ عجیب سعادت و خوشی بخشی ہے، باب جبرئیل سے باہر نکلو تو جو عمارت سامنے نظر آتی ہے معلوم کیا کہ یہ کیا ہے؟ مدرسہ علوم شرعیہ، کس نے بنایا؟ ہندی غلاموں نے، آگے بڑھے تو دار الصنائع حیدرآباد نظر آیا، کس نے بنایا؟ ہندی غلاموں نے، آگے بڑھے تو مدرسہ سلفیہ رشیدیہ نظر آیا، کس نے بنایا؟ ہندی غلاموں نے، اس کے مقابل ایک عظیم عمارت نظر آئی، یہ کیا ہے؟ دار الایتام، کس نے بنایا؟ ہندی غلاموں نے، اب باب السلام سے مسجد نبویؐ میں داخل ہوئے تو کئی حلقے نظر آئے تبلیغ و دعوت کے، یہ کون کررہے ہیں؟ ہندی غلام، فرمایا اللہ کی عجب شان ہے یہ تمام سعادتیں پسماندہ ہندیوں کو عطا فرمادیں، بندہ نے دل میں کہا اس دور میں سیرت پاک صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہندی غلاموں ہی سے لکھائی گئی،

خادم:- افتخار فریدی - مراد آباد - ۱۳؍ مارچ سنہ

(۲)

مکرم و محترم برادرم صباح الدین صاحب: السلام علیکم

ایران سوسائٹی کی عمر خیام تقریبات میں روز اول آپکا مقالہ سننے کا موقع نہیں مل سکا،

اس کا افسوس تھا، لیکن سیمپوزیم میں شکریہ ادا کرنے کے سلسلہ میں آپ کی مختصر تقریر سے مقالات کا
عطر کہنا چاہیے، سننے کے بعد یہ افسوس جاتا رہا اور معلوم ہوا کہ اس نحیف و نزار جسم میں بھی ایک آتش
فشاں نہاں ہے اور ان ناتواں رگوں میں ایک ایسی آتش سیال رواں دواں ہے جو فٹز جیرالڈ
جیسے شہرت یافتہ "رباعی گر" کی فتنہ گری پر اس شدت کے ساتھ شعلہ بار ہو سکتی ہے اور یہ
بھی دیکھا کہ اس شیریں دانی میں ایک غیر زبان کا غیر معمولی زبان داں پنہاں ہے، جو شیکسپیرانہ انداز
کی انشا پردازی اور زبان و بیان سے بے شمار و بے اختیار خراجِ تحسین و آفریں سامعین سے وصول
کر لیتا ہے، شاعر مشاعرہ لوٹتا ہے اور آپ نے اپنی نثری شاعری سے سیمپوزیم لوٹ لیا، حقیقت یہ
ہے کہ آپ نے مختصر الفاظ میں جو کچھ کہا وہ جذبات و تاثرات سے لبریز اور حقیقت سے پُر تھا

سیمپوزیم میں محترم ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے صدارت کے فرائض کا حق بخوبی ادا کیا، انھوں نے
تقریباً سب کو پورا وقت اور پورا موقع دیا لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے خود اپنا مقالہ مختصر کرنے
اور کم سے کم وقت لینے میں پیش قدمی کی۔ ان کے ساتھ اور بھی کئی حضرات کو اختصار سے کام لینا
پڑا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس یکایک کتر بیونت اور کانٹ چھانٹ کی وجہ سے تسلسل نہ رہا۔ سنانے والے
مطمئن نہیں ہوئے اور آخر میں یہ ایک خانہ پری سی ہو کر رہ گئی۔ مقالہ اگر صرف قارئین کے لئے ہو،
ہو تو طوالت اور وقت کے تعین کا سوال ہی نہیں ہوتا لیکن اگر سامعین کے لئے ہو تو اختصار
اور وقت کے تعین کا لحاظ ضروری ہے، جیسے ریڈیو میں تقاریر کا وقت مقرر ہوتا ہے اور اسی وقت
کے اندر اندر اس کی تکمیل ضروری ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو سنانے والوں کو بے اطمینانی اور سننے والوں
کو بے لطفی نہ ہوتی۔

سیمپوزیم میں فاضل مقالہ نگاروں نے عمر خیام کو بہ حیثیت شاعر، فلسفہ داں، ریاضی داں،
سائنس داں اور ہیئت داں پیش کیا لیکن کسی نے اسے صرف بہ حیثیت انسان پیش نہیں کیا،

کسی عظیم ہستی کی فنی، علمی، تحقیقی اہمیت اپنی جگہ ہے لیکن زندگی کا یہ پہلو بھی بڑی اہمیت اور کشش رکھتا ہے
جو دلوں پر مثل برق اثر انداز ہوتا ہے، کوئی عالم اگر عالم باعمل ہو تو باعثِ فیوض و برکات ہے اور
اگر بے عمل ہو تو بھی باعثِ عبرت ہے کہ حیف سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہ ہو سکا۔

کوئی انسان کتنا ہی بڑا ہو یا چھوٹا۔ انسانیت کی بلندی ہی اسے بناتی ہے اور ایک عظیم انسان
کا رتبہ عطا کرتی ہے اور اسے زندہ جاوید بناتی ہے، یہ بھی قادر مطلق کا ایک امتحان ہی ہے کہ دیکھیں کون
اپنی تنی ہوئی گردن اور سر پُر غرور لئے بے سایہ و بے ثمر شجر سرو کی مانند اپنی انا میں بے فیض تنا کھڑا ہے،
اور کون میوہ کی ڈالی کی طرح جھکا سر نیاز خم کئے اپنی شاخ ثمر سے دوسروں کو فیض پہنچاتا ہی اسی لئے کہ

فرشتہ سے بہتر ہے انسان بننا — مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

لیکن اس لوٹ مار نوچ کھسوٹ کے دور میں، انسان کا لفظ، انسانیت کی باتیں فرسودہ سی لگتی ہیں
اور کانوں میں رس کے بجائے زہر گھولتی معلوم ہوتی ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ہم عظیم انسانوں
کی عظیم داستانیں، ان کی انسانیت اور انسان دوستی کی یادیں اور ان کے علم و عمل کی باتیں دہرائیں
اور دہراتے رہیں،

سیمپوزیم میں کسی پروفیسر صاحب نے "عمر خیام بحیثیت سائنس داں" پیش کیا تھا غالباً انھوں
نے خیام کو کلنڈر اور ماہ و سال اور ایام کی تقسیم کا موجد بتایا تھا، ممکن ہے میرے سننے سمجھنے میں غلطی
ہوئی ہو۔ وقت کی کمی کی وجہ سے کئی مقالات بڑے عاجلانہ انداز میں پڑھے گئے تھے۔ بہرحال بعض مغربی
مورخین و محققین نے نمرود کو جہاں اور بہت سی چیزوں کا موجد بتایا ہے وہاں اسے ماہ و سال، ایام کی
تقسیم اور دن کو چوبیس ۲۴ گھنٹوں، دقیقوں، ثانیوں میں تقسیم کا موجد بھی بتایا ہے۔ مندرجہ ذیل اسکی چند اختراعات
ایجادات کا ذکر

1 "The Golen Bough"
BY Sir James George Frazer

2. The Two Babylons by Alexander Hislop اور

میں ملتا ہے،

۱۔ دائرے کی ۳۶۰ درجے میں تقسیم، ایک درجہ کی ۶۰ دقیقوں میں تقسیم اور ایک دقیقہ کی ۶۰ ثانیوں میں تقسیم۔

۲۔ دن کی چوبیس گھنٹے میں تقسیم اور گھنٹے کی ۶۰ منٹ میں اور منٹ کی ۶۰ سکنڈ میں تقسیم، نئے دن کا آغاز غروب آفتاب کے بجائے رات کے بارہ ۱۲ بجے سے، کیونکہ سورج کے غروب کا وقت تبدیل ہوتا رہتا ہے۔

۳۔ شمسی سال کی بارہ ۱۲ مہینوں میں تقسیم بروج کے بارہ کہکشاں کے مطابق

۴۔ بروج کے حساب سے زائچہ کا شمار

۵۔ فراست الید، نجمی اور پیشن گوئی۔

علاوہ ازیں خام اینٹوں کا پکانا، بڑی بڑی عمارتوں، پلوں، مندروں محلوں اور نہر بنانے کا حساب یعنی علم مہندسی، مٹی کے ٹکڑوں پر تحریر کیا بنے کی دریافت اور اس کا معدنیات سے نکالنا، دو دھاتیں ملا کر کانسی بنانے کی ایجاد۔ جادو یعنی لوگوں پر نامعلوم طریقہ سے اثر ڈالنا جسے آجکل ہپنوٹزم بھی کہا جا سکتا ہے۔ وغیرہ

ممکن ہے پروفیسر صاحب نے خیام کو متذکرہ ایجاد کا نہیں اس میں کسی تبدیلی ترمیم یا اضافہ کا ذمہ دار ٹھہرایا ہو۔ تحقیق میں اختلاف رائے کا ہونا ضروری ہے، پروفیسر صاحب نے جو کچھ بھی کہا ہوگا وہ کسی حوالہ سے ہی کہا ہوگا، بہر حال میرا مقصد اس بحث سے نہیں ہے، حقیقت واقعہ جو کچھ بھی ہو، قابل ذکر صرف وہ بات جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ ایک انسان کی انسانی بلندی ہی اس کی علمی برتری اس کے کام اور اس کے نام کو دوام بخشتی ہے،

"جنوری کے "معارف" میں آپ کے شذرات دیکھنے کا موقع ملا۔ اسلام میں فرقوں کی تاریخ آپ نے نہایت مختصر لیکن بجامع طور پر بیان کردی ہے، یہ بات قابل ذکر ہے جسے ہر قاری جس کی نظر اس طرف پہنچی ہے سراہے گا کہ آپ نے اپنے دامن کو ہر طرح اور ہر پہلو سے کسی بحث میں الجھنے سے خوب بچایا ہے ورنہ عموماً ایسی تحریروں سے نادانستہ ہی کوئی نہ کوئی شوشہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ اس کی ذرا تفصیل دیدیئے اور اسے کتابی شکل میں شائع کر دیجئے یہ بہت کارآمد، مفید اور پر از معلومات چیز ہوتی،

والسلام " آغا رشید مرزا "

کلکتہ ۲۲ مارچ ۸۰ء

مطبوعات جدیدہ

رسالۃ الامعان فی اقسام القرآن از المعلم عبد الحمید الفراہی، متوسط سائز، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، صفحات: ۷۶ قیمت دس روپیہ، پتہ:۔(۱) دار القرآن الکریم شارع بلالی، ضدق البر ۲۵۰۶۶ کویت (۲) دائرۂ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڈھ۔ یو۔ پی

یہ کتاب ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تفسیر نظام القرآن کا دیباچہ ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جابجا قسمیں کھائی ہیں، مولانا نے ان کے متعلق اس رسالہ میں اصولی مباحث علحدہ تحریر فرمائے ہیں تاکہ اصل تفسیر میں ان بحثوں کا اعادہ و تکرار نہ ہو، دار المصنفین نے ۱۳۴۹ھ میں اس کا پہلا اڈیشن مصر سے طبع کرایا تھا، پھر چند بار اس کے اردو ترجمے دائرۂ حمیدیہ سے شائع ہوئے، اب یہ نیا عربی اڈیشن دار القرآن الکریم کویت نے شائع کیا ہے، اس میں قرآن مجید کی قسموں پر وارد ہونے والے شبہات و اعتراضات کا مدلل جواب دیا گیا ہے، اس سلسلے میں پہلے امام رازیؒ اور حافظ ابن قیمؒ کے جوابات نقل کرکے ان پر تبصرہ کیا ہے، اس کے بعد قسم کی ضرورت، اس کی مختصر تاریخ اور عربی زبان میں اس کے استعمال کے مختلف طریقوں وغیرہ کو بیان کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن میں قسموں کی غرض شہادت و استدلال ہے اور دلیل کے لئے قسم کا پیرایہ اختیار کرنا مقتضائے بلاغت ہے، یہ رسالہ قسموں کے متعلق مفید، اصولی و ضروری مباحث کے علاوہ گوناگوں قرآنی حقائق و معلومات پر بھی مشتمل ہے، شروع میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کا وہ مقدمہ بھی شامل ہے جو انھوں نے اس کے پہلے اڈیشن کے لئے تحریر فرمایا تھا، اس میں مولانا فراہی کے سوانح حیات اور تصنیفات کا اجمالی ذکر ہے لیکن یہ مقدمہ

نصف صدی پہلے لکھا گیا تھا اس میں مولانا کی جن کتابوں کو اس وقت غیر مطبوعہ بتایا گیا ہے، ان میں سے بعض اب چھپ گئی ہیں، حواشی میں اسکی صراحت ضروری تھی۔

شعلۂ نیم سوز از جناب فضا ابن فیضی صاحب تقطیع متوسط، کاغذ کتابت طباعت نہایت عمدہ، صفحات ۲۰۰ مجلد مع خوب صورت گرد پوش، قیمت للعکر، پتہ (۱) فیضی پبلیکشنز، مئوناتھ بھنجن (۲) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، بمبئی، علی گڑھ وغیرہ

جناب فضا ابن فیضی ایک ممتاز پختہ مشق اور مشہور شاعر ہیں، ان کو نظم اور غزل دونوں پر یکساں پوری قدرت ہے، کئی برس پہلے ان صفحات میں ان کی غزلوں کے مجموعہ "سفینۂ زرگل" کا ذکر آچکا ہے، زیر نظر مجموعہ ان کی نظموں پر مشتمل ہے، فضا صاحب کی غزلوں اور نظموں کے طرز ادا اور طریقۂ اظہار میں یکسانی ہوتی ہے، اس لئے ان کی غزلیں نظم نما اور نظمیں غزل نما ہوتی ہیں، زندگی کے مختلف شعبوں کی موجودہ گراوٹ اور بے راہ روی اور معاشرہ کے ہر طبقہ کے افراد کی ضمیر فروشی حق سے اغماض، سطحیت پسندی اور ظاہرداری ان کی شاعری کا خاص موضوع ہے، انھوں نے ادب، شاعری، صحافت، سیاست، مذہب اور اخلاق میں جو تصنع، شاعروں اور ادیبوں میں جو کھوکھلا پن، سیاستدانوں میں جو خود غرضی اور پارساؤں میں جو ریاکاری پیدا ہوگئی ہے ان کا ذکر بڑے دکھ بھرے انداز میں کیا ہے، ان کا خیال ہے کہ موجودہ دور میں باطل میں حق، اندھیرے میں اجالا، جھوٹ میں سچ اور کوڑیوں میں چاندی کے ورقوں کی ملمع کاری ہے اس لیے رذیل، شریف، بوالہوس، اہل علم اور فرعون، موسیٰ کے لباس میں دکھائی دیتے ہیں، ہر طرف بے دانشی، کم آگہی، علم و ہنر اور عقل و خرد کی بے مائگی، تحسین ناشناسی اور اہل فن و اصحاب کمال کی ناقدری کا مظاہرہ ہو رہا ہے، فضا صاحب کی نظموں سے ان کی شدتِ احساس، قوتِ مشاہدہ، موجودہ حالات سے باخبری اور فکر و خیال کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے، اس مجموعہ کی نظمیں چار

مختلف عنوانات کے تحت مرتب کی گئی ہیں، بعض نظموں میں موجودہ قومی و ملی مسائل پر بے لاگ تبصرہ ہے، ایک نظم میں اُردو زبان کے ساتھ جو سیاسی کھیل کھیلا جارہا ہے اس کا ذکر ہے، ایک اور نظم میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی گذشتہ تاریخ اس کی عظمت، خصوصیت، کردار اور ادبی خدمات وغیرہ کو بیان کرکے آخر میں اس کے خلاف اربابِ سیاست اور ملت کے جعفر و صادق کی موجودہ سازش کو بے نقاب کیا ہے، دارالمصنفین کے جشنِ طلائی پر بھی ایک اچھی نظم ہے، "خونِ صد ہزار انجم" کے عنوان سے ملک کے بہیمانہ فسادات کا المناک ذکر ہے، آخری حصہ میں چند مشاہیر ادب و سیاست کے مرثیے ہیں، فضا صاحب کی نظموں میں جدت و طرفگی کے باوجود روایت کی پاسداری بھی ہے، وہ طرزِ ادا اور طریقۂ تعبیر کو شاعری کا ضروری اور اہم عنصر قرار دیتے ہیں اور ترقی پسندی اور جدیدیت نے اردو شاعری کو جو لب و لہجہ دیا ہے اس کو وہ اُردو شاعری کے مزاج سے ہم آہنگ اور اس کی شعری روایت کے شایانِ شان نہیں سمجھتے ہیں، ان کا کلام موجودہ ماحول کی پستیوں اور بے اعتدالیوں پر مکمل تبصرہ ہونے کے باوجود نعرہ بازی سے خالی ہے، وہ عہدِ حاضر کے پُر آشوب حالات کی عکاسی اس طرح کرتے ہیں کہ نظموں کی روانی اور تازگی میں فرق نہیں آنے دیتے، اُردو کی کلاسیکل شاعری پر ان کی اچھی نظر ہے، فارسی و عربی میں بھی اُنکی استعداد اچھی ہے اس لئے وہ موضوع کے اعتبار سے مناسب الفاظ اور عمدہ پیرایۂ بیان اختیار کرتے ہیں، ان کے استعارے، تشبیہیں اور ترکیبیں غریب اور نامانوس نہیں معلوم ہوتیں، کتاب کی طباعت و کتابت بھی عمدہ ہے اس لئے یہ معنوی خوبیوں کے ساتھ ظاہری حسن و نفاست سے بھی آراستہ ہے، ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوچکی ہے، امید کہ اور بھی زیادہ ہوگی جس کی یہ مستحق ہے۔

"ض"

جلد ۱۲۵ ماہ رجب المرجب ۱۴۰۶ھ مطابق ماہ جون ۱۹۸۶ء عدد ۶

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد